حصار
مظفر وارثی

حصار

تزئین و اہتمام اشاعت : خالد شریف

ضابطہ ـــــــ پہلا ایڈیشن
ناشر ـــــــ ماورا پبلشرز
مطبع ـــــــ لائن آرٹ پرنٹرز
سال اشاعت ـــــــ فروری ۱۹۸۸ء
قیمت ـــــــ ۴۵/- روپے

حصار

مظفر وارثی

ماورا پبلشرز

۳- بہاولپور روڈ ○ لاہور

اِنتساب

والدہ مرحومہ کنیزِ فاطمہ کے نام

جن کی سادگی اور معصومیت

ہمیشہ مجھے چراغ دکھاتی رہے گی۔

میں کیا کروں مجھے سچ بولنے کی عادت ہے
بُرا لگے تو مِرا اعتبار مت کرنا

ترتیب

امن

میں امن کا پیامی
سچائی مجھ کو چاہے
انسانیت سرا ہے
تہذیب دے سلامی
میں امن کا پیامی

لُوٹے خرد کسی کو تڑپے جنون میرا
کھاتا ہے زخم کوئی بہتا ہے خُون میرا
ہر جسم میں مِری جاں
میری نظر میں یکساں
بیرونی و مقامی
میں امن کا پیامی

چہرے پہ ہر کسی کے آنکھیں مری جڑی ہیں
آفاق کو سمیٹے میری حدیں کھڑی ہیں
میں کائنات زادہ
ہر ذہن میرا جادہ
میری صدا عوامی
میں امن کا پیامی

ٹوٹے ہوئے دلوں میں غمخوار کی طرح ہوں
دھرتی کے دائرے پر پرکار کی طرح ہوں
میں رونقوں سے کھیلا
کیسے چلوں اکیلا
سنگت ہے میری خامی
مَیں امن کا پیامی

ذرّوں کا میں فدائی تارے اسیر میرے
خوشبو مری ریاست جھونکے سفیر میرے
آئینہ ذات میری
دن جیسی رات میری
میری سحر دوامی
مَیں امن کا پیامی

طوفاں سے بھی ہوں افضل کمتر حباب سے بھی
گہرائی سے بھی ناتا اور سطحِ آب سے بھی
جھانکوں جو اپنے اندر
خود ناؤ خود سمندر
خود ہیچ خود گرامی
مَیں امن کا پیامی

تنکوں کے گھر بنانے بجلی کے ساتھ نکلوں
جلتے چراغ لے کر آندھی کے ساتھ نکلوں

بیدار میرے سپنے
اغیار ہوں کہ اپنے

میں ہر کسی کا حامی
میں امن کا پیامی

ہر آدمی کے دُکھ سے دِل جس کا شق نہ ہوگا
اس کو جہاں میں کوئی جینے کا حق نہ ہوگا

سُن غور سے زمانے
آیا ہوں میں مٹانے

آقائی و غلامی
میں امن کا پیامی

آپس میں لوگ چاہے بانٹیں زمیں مظفر
فنکار فاصلوں میں بٹتا نہیں مظفر

میں سب کے فن کا طالب
ٹیگور ہو کہ غالب

اقبال ہو کہ جامی
میں امن کا پیامی

"بے سمتی"

زندگی کس طرف جا رہی ہے
آدمی میں نہیں آدمی پن
پھول ہیں اپنی خوشبو کے دشمن
روشنی سائے پھیلا رہی ہے
زندگی کس طرف جا رہی ہے

ہم یہ کیسا سفر کر رہے ہیں، اپنے اوپر قدم دھر رہے ہیں
زندگی ہم نے یکمشت پائی، اور قسطوں میں ہم مر رہے ہیں
ہر کوئی بھیڑ میں اکیلا
کتنا اجڑا ہوا ہے یہ میلا
بے حسی رقص فرما رہی ہے
زندگی کس طرف جا رہی ہے

عہدِ حاضر ہے کتنا مثالی جتنا بھرپور اتنا ہی خالی
پتھروں کے زمانے کی شاید چاہتی ہے یہ دنیا بحالی
امن کے گیت ہیں ہر زباں پر
اور در پردہ سارے جہاں پر
اک تباہی سی منڈلا رہی ہے
زندگی کس طرف جا رہی ہے

عقل گرویدۂ کم نگاہی — علم و فن قائلِ خیر خواہی
عدل بھی اہلِ طاقت کا رسیا — پیار بھی دے ستم کی گواہی
ہوش رہنے لگا مستیوں میں
خواہشِ ارتقا پستیوں میں

مرحلہ وار دفنا رہی ہے
زندگی کس طرف جا رہی ہے

غیر محفوظ سارے بسیرے — سب اصولِ تمدن لُٹیرے
چہرۂ وقت پر ہے اُداسی — تازگی کھو رہے ہیں سویرے
کیا ہے سورج کا رُخ پھیرنے والا
آسماں بھی ہے کیا گرنے والا
کیا زمیں کو بھی موت آ رہی ہے
زندگی کس طرف جا رہی ہے

تعارُف

ہر کسی کے لیے
خُونِ دِل کے دِیے
مَیں جلاتا رہوں
مُسکراتا رہوں
کون آخر ہُوں مَیں
کیسا شاعِر ہُوں مَیں

اجنبی سے مِلوں آشنا کی طرح
سب کے دامن سے لپٹوں ہوا کی طرح
ہر کسی کی نظر
جس کا زادِ سفر
وُہ مسافر ہُوں مَیں
کیسا شاعِر ہُوں مَیں

میری بیتابیاں چہرہ چہرہ پھریں
بجلیاں سب کے حصّے کی مجھ پر گریں
وہ اُڑائیں ہنسی
وقفِ آوارگی
جن کی خاطر ہُوں میں
کیسا شاعر ہُوں میں

میرا حُسنِ صدا ہے دُہائی مری
میرا لُٹنا ہی یارو کمائی مری
دے کر اپنا سکوں
غم زمانے کے لُوں
کیسا تاجر ہُوں میں
کیسا شاعر ہُوں میں

میرے جذبات پر بارشِ سنگ ہو
میری آواز پھر بھی نہ بے رنگ ہو
تنگ دل کم نظر
ہے زمانہ مگر
پھر بھی حاضر ہوں میں
کیسا شاعر ہوں میں

وقت کے تیز جھونکوں سے ڈرتا بھی ہوں
اور بھڑکتی ہوئی بات کرتا بھی ہوں
خُود ہی بنتا ہوں چور
خُود مچاتا ہوں شور
اپنا مُخبر ہوں مَیں
کیسا شاعِر ہوں مَیں

لوگ اندھیروں میں نکلیں دُھواں اوڑھ کر
شیشہ پہناتے مُجھ کو طلُوعِ سحر
کِس قلندر سے ہوں
وُہ ہی اندر سے ہوں
جو بظاہر ہوں مَیں
کیسا شاعر ہوں مَیں

قلم کار

شام زندہ ہے تری، تیری سحر زندہ ہے
اَے وطن تیرا قلمکار اگر زندہ ہے

ایک تاریخ سخنور بھی لِکھا کرتے ہیں
قوم زندہ ہے وُہی جس کا ہُنر زندہ ہے

میرا دل بھی تو دھڑکتا ہے تری مٹی میں
بجھ نہیں سکتے یہ منظر، جو نظر زندہ ہے

گونجتے رہتے ہیں کانوں میں ہواؤں کے گجر
قافلے جاگتے ہیں راھگزر زندہ ہے

آبلے پھوڑ کے ہم پیاس بجھائیں اپنی
راہ مشکل سہی احساسِ سفر زندہ ہے

شبنمی کیوں نہ ہو آخر لب و لہجہ میرا
میرے سینے میں محبت کا شرر زندہ ہے

کیا مزے لے کے دھواں چاٹ رہی ہے خوشبو
آگ ہے زیرِ زمیں پھر بھی شجر زندہ ہے

گھیر رکھّا ہے مجھے زندگیوں نے گویا
میری دھرتی مری گلیاں مرا گھر زندہ ہے

کوئی جھونکا مجھے گمراہ نہیں کر سکتا
اے مظفرؔ مرے اندر کا خضر زندہ ہے

چودہ اگست

یہ دن اپنے آپ کو دُہرانے کا دِن ہے
پتھر جیسے لوگو شیشے جیسا دِن ہے

آج کے دِن خوابوں نے اِک تعبیر لکھی تھی
اُس تعبیر میں قُدرت نے تاثیر لکھی تھی
اُس تاثیر کا اِک زندہ اور سچّا دِن ہے

دِل والوں نے ذہنوں کو آزاد کیا تھا
ٹوٹے تاروں سے نغمہ ایجاد کیا تھا
دیواروں میں در کر دینے والا دِن ہے

چھاؤں تو چھاؤں ہے جلتی دُھوپ غنیمت اسکی
ڈھیروں حکمت لاکھوں جانیں قیمت اسکی
سوچا کبھی کیا ہم نے کتنا مہنگا دِن ہے

بے ترتیبی، نفرت، شک معیار ہیں اپنے
کیا اِس کا مقصد تھا کیا کردار ہیں اپنے
ہم کتنے مَیلے یہ کِتنا اُجلا دِن ہے

کِس کا ظاہر ہے قائد کے باطن جیسا
کِس دِن کو ہم کہہ سکتے ہیں اس دن جیسا
یہ چھتّیس برس کی بھیڑ میں تنہا دِن ہے

لوحِ وقت پہ ہم حرفِ آخر ہو جائیں
آؤ لوگو پہلے جیسے بکھر ہو جائیں
سمجھو آج بھی پہلی رُت ہے پہلا دِن ہے

(۱۴ اگست ۱۹۸۳ء)

"آئینہ"

یہ اپنے کردار یہ اپنے اَوصاف
چہرہ بھی اِک خول تن بھی ایک غلاف

سب کچھ ہے موجود
لیکن سب بے سُود
روشنیاں مقصُود
اور باتیں بارُود
عاجزیاں نمرُود
بندہ بھی معبُود
اتنا گرد آلود
آئینہ شفاف
تن بھی من کی گور
خواہش بن کا مور
عقل ذہانت خور
گویائی منہ زور
بینائی شب کور
اپنے اندر چور
آپ مچائیں شور
مُجرم ہے اِنصاف

اِک دریا اِک ناؤ
اور اَن گنِت بہاؤ
خُوشبُو کا برتاؤ
پھُولوں پر پتھراؤ
کیسی چاہت چاؤ
دھن سے صرف لگاؤ
پیتل زر کے بھاؤ
بیچیں اب صرّاف

اُونچی ہے دستار
پست مگر کردار
اُڑنے کو تیّار
زیرِ پر منقار
اُوپر سے کہسار
اندر غار ہی غار
آنکھوں میں ہے پیار
دِل کے بیچ شگاف

معیارِ تنقید
جھوٹوں کی تائید
سب الفاظ یزید
ہر مفہوم شہید
علم ہے نا اُمّید
جہل منائے عید
قحطِ فکر شدید
سچ بھی سچ کے خلاف

تیزی سے حالات
بدلیں اب دن رات
دے جو وقت کو مات
اُس کو صرف ثبات
ہاتھ پہ رکھ کر ہاتھ
چل اوروں کے ساتھ
کرتے ہیں کم ذات
اپنے گردِ طواف

(۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء)

تلاش

میں چور نہیں تم چور نہیں
پھر درد کی دولت کہاں گئی
دل کہاں ہیں چاہت کہاں گئی
کیا سب زندہ در گور نہیں

چہروں پہ ہیں آنکھیں پتّھر کی — بالکل یہی حالت اندر کی
پھُولوں سے بھی نازک ہے لہجہ — الفاظ میں دھار ہے خنجر کی
مہنگا نہ ملے ارزاں نہ ملے
ڈھونڈے سے بھی کیوں انساں نہ ملے
جب کوئی بھی آدم خور نہیں!

شریانوں میں خُوں سرد ہُوا — جذبہ آوارہ گرد ہُوا
سرسبز صداقت سوکھ چلی — بلّور سویرا زرد ہُوا
بیٹھی آواز خطیبوں کی
مُردہ ہوئی سوچ ادیبوں کی
شاعر کے قلم میں زور نہیں

محفوظ ہے علمِ کتابوں میں زندہ تو ہیں لیکن خوابوں میں
رستہ پوچھیں گمراہی سے ڈھونڈیں گہرائی سرابوں میں
تصویر بنائیں پانی پر
اور خوش ہیں اِس نادانی پر
ہاتھوں میں لہر ہے ڈور نہیں

ہر انساں ایک عجوبہ ہے حیرت سب کی محبوبہ ہے
ناتا ہے سات سمندر سے اور دِل تالاب میں ڈوبا ہے
آوازیں تنہا لَے تنہا
اِس بھیڑ میں سب نغمے سب تنہا
ہنگامہ ہے پھر بھی شور نہیں

اِس دانائی کے کیا کہنے ہیں سنگ بکف شیشہ پہنے
من میں کالک ہی کالک ہے اور تن پر رنگوں کے گہنے
اِمروز پہ ڈالیں ہم پردا
اور چلّائیں فردا فردا
فردا ہم جیسا کور نہیں

(۱۷ نومبر ۱۹۷۸ء)

"حُسن"

دھیان میں گیان میں جاپ میں جوگ میں
پھول میں سنگ میں راگ میں روگ میں
حُسن اپنے کسی رنگ و جوہر میں ہو
دیکھنے کے لیے آنکھ درکار ہے.

چاہے آنکھوں کے گہرے سمندر میں ہو
آتی جاتی رُتوں میں ہو منظر میں ہو
روشنی اور محبّت کا اظہار ہے

رنگِ عشّاق بھی بُو ئے معشوق بھی
حُسن خالق بھی ہے اور مخلوق بھی

تربوزی قلم کار○

مِرے وطن کے اَدیب و شاعر

سمندروں سا وجُود جن کا

جو اپنی گہرائیوں میں گُم ہیں

ہجوم ہے اِرد گِرد لیکن

یہ اپنی تنہائیوں میں گُم ہیں

نہ پُورے غائب نہ پُورے حاضر

مِرے وطن کے ادیب و شاعر

دیا کرے دستکیں زمانہ

مگر درِ شخصیت نہ کھولیں

یہ آدمی ہیں کہ سنگ زادے

خلاف بولیں نہ حق میں بولیں

گدائے باطن امیرِ ظاہر

مِرے وطن کے ادیب و شاعر

○ ایک مخصوص طبقۂ فکر

نہ فکر ان کو معاشرے کی
نہ واسطہ کچھ سماج سے ہے
نہ آنے والے دِنوں سے ناتا
نہ رابطہ کوئی آج سے ہے
تو پھر یہ زندہ ہیں کس کی خاطر
مِرے وطن کے ادیب و شاعر

لیے پھریں یہ وجُود کیسا
نہ اپنی گردن نہ اپنے کندھے
اسی ہُنر پہ ہے ناز اُن کو
قلم اپاہج حروف اندھے
یہی ہیں ماحول کے مصوّر
مِرے وطن کے ادیب و شاعر

دِکھائے ماحول کا جو چہرہ
حیات ایسا اِک آئینہ ہے
مَلیں جو کالک اِس آئینے پر
اَدب سے اُن کی مُراد کیا ہے
جواب دینے سے کیوں ہیں قاصر
مِرے وطن کے ادیب و شاعر

جنھیں ہو زندہ ادب کا دعویٰ
انھیں سیاست سے بیر کیوں ہو
جُدا نہیں دین سے سیاست
ادب سیاست بغیر کیوں ہو
فضائے وہم و گماں کے طائر
مرے وطن کے ادیب و شاعر

سمندروں کی ہے قوم پیاسی
یہ خوش ہیں ایک آدھ لہر دے کر
مسرتوں کی تلاش میں ہیں
یہ اپنی غیرت کو زہر دے کر
مزارِ احساس کے مجاور
مرے وطن کے ادیب و شاعر

لہو شرابی بدن اندھیرا
زبان گاہک نگاہ منڈی
ضمیر نوّاب ذہن کوٹھا
خیال عیاش سوچ رنڈی
بتائیں کیا چاہتے ہیں آخر
مرے وطن کے ادیب و شاعر

ثقافتِ سُرخ کے یہ رسیا
پُرانی تہذیب کے پجاری
علُوم اسلاف کے یہ دُشمن
جہالتِ غیر کے بھکاری
انا ئے قوم و وطن کے تاجر
مرے وطن کے اُدیب و شاعر

پڑھو اگر ان کو طا ترانہ
نہ کوئی پہلو نئے غور نکلے
جو اِن کو بین السطور دیکھو
تو ان کا مطلب کچھ اور نِکلے
بساطِ تخلیق کے ہیں شاطر
مرے وطن کے اُدیب و شاعر

ٹھکانہ زیرِ زمیں ہے ان کا
اور انگلیاں نبض پر ہوا کی
مشاعروں میں پڑھیں یہ نعتیں
مباحثوں میں یہ اِشتراکی
نہ یہ مُسلمان ہیں نہ کافر°
مرے وطن کے ادیب و شاعر

° بالکسر بھی فصیح ہے

(۱۶ر اکتوبر ۸

اِنتباہ

جانے والے ٹھہر
جا رہا ہے کِدھر
اِمتحاں ہے سَفر
ہر طرف راہبر
راستوں کے بھنور ــــ الاماں الحذر

دِل تمنّائے عہد آفرینی کرے
اَور فضا بیعتِ بے یقینی کرے
دیکھنے میں ہَری
کشتِ دیدہ دَری
پھر بھی قحطِ نظر ــــ الاماں الحذر

ذہن کیا شکل بھی خُوبصورت نہیں
حسنِ کردار کی بھی ضرورت نہیں
بے خُودی ، بانکپن
بے ضمیری بھی فن
بے حسی بھی ہُنر ــــ الاماں الحذر

زندگی چند لاشوں کے ساتھ آ گئی
آدمیت درندوں کے ہاتھ آ گئی
گفتگو جھول سی
صورتیں خول سی
ذہن میں شر ہی شر —— الاماں الحذر

زہر آلود خوشبو گلابوں میں ہے
مبتلا یہ چمن کن عذابوں میں ہے
ہر نگر ہر گلی
سازشوں کے ولی
باغیٔ پیشہ ور —— الاماں الحذر

راستہ ہے مگر گرد آلود ہے
گرد پیروں تلے ہے کہ بارود ہے
پھٹ نہ جائے زمیں
بن نہ جائے کہیں
ساری دنیا کھنڈر —— الاماں الحذر

لفظ محروم ہوں اپنے مفہوم سے
نکلے میت لغت کی بڑی دھوم سے
سچ، فقیرِ سند
عشق مانگے مدد
عقل شوریدہ سر —— الاماں الحذر

کہہ رہے ہیں یہ بدلے ہوئے طور ہی
چل رہا ہے یہ مہرے کوئی اور ہی
وقت شاطر ہوا
ہو رہا ہے جُوا
ہر کوئی داؤ پر ـــــ الاماں الحذر

نعرہ زن ہے تعصّب زمیں بانٹ دو
یعنی شاخیں سمجھ کر جڑیں چھانٹ دو
زخم ہوں بس ہرے
راج پت جھڑ کرے
سُولیاں ہوں شجر ـــــ الاماں الحذر

جاگ تو سب رہے ہیں مگر خواب میں
کاغذی لوگ ہیں کشتیِ آب میں
ہوش آئے گا کب
ڈوب جائیں گے سب
ناؤ ڈوبی اگر ـــــ الاماں الحذر

نام ہر کوئی لیتا ہے اسلام کا
رابطہ سب کا اسلام سے نام کا
کب سے سُوئے حرم
اُٹھ رہے ہیں قدم
اور نتیجہ صفر ـــــ الاماں الحذر

تقسیم

سارے غم بانٹ لیں ہر خوشی بانٹ لیں
آؤ آپس میں ہم زندگی بانٹ لیں

ڈال لیں ریت اگر بانٹ لینے کی ہم
دو گنی ہو خوشی نصف رہ جائے غم
اشک تقسیم کر لیں ہنسی بانٹ لیں
آؤ آپس میں ہم زندگی بانٹ لیں

پیاس کا رابطہ بھی سمندر سے ہو
کوئی مفلس نہ باہر نہ اندر سے ہو
جتنی دولت ہے احساس کی بانٹ لیں
آؤ آپس میں ہم زندگی بانٹ لیں

رکھیں بنیاد اگر عدل کی پیار کی
کتنی اونچی عمارت ہو کردار کی
جل اٹھے ہر دیا روشنی بانٹ لیں
آؤ آپس میں ہم زندگی بانٹ لیں

راستے ایک ہوں منزلیں ایک ہوں
مختلف لوگ بھی جب ملیں ایک ہوں
آئینے ہی نہیں ذہن بھی بانٹ لیں
آؤ آپس میں ہم زندگی بانٹ لیں
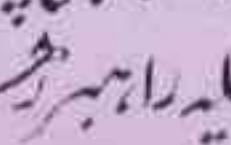
نقرئی صبح پر سرمئی شام پر
سب کا حق ہو عنایاتِ ایّام پر
ہر قدم ہر نظر ہر گھڑی بانٹ لیں
آؤ آپس میں ہم زندگی بانٹ لیں

اِتحاد

آدمی جو صرف اپنا ہے کسی کا کچھ نہیں
اُس کا دل اُس کا ضمیر اُس کی تمنا کچھ نہیں

شیشۂ جُوئے رواں میں اپنا چہرہ دیکھ لے
پہلوئے کہسار میں جا کر قد اپنا دیکھ لے
اپنے آگے دُوسروں کو جو سمجھتا کچھ نہیں

اپنی اپنی راہ چلنے سے کسے مقصد مِلا
واسطوں سے رابطوں سے ہی چلا ہر سلسلہ
پیڑ چھایہ راہبر رہرو اکیلا کچھ نہیں

حرف ہوں سارے جُدا تو ایک نقطے سے حقیر
لکھ دیے جائیں ملا کر تو عبارت بے نظیر
کھیل سب مفہوم کا ہے حرف و نقطہ کچھ نہیں

سانس ٹوٹے سانس سے تو ختم ہو جائے حیات
لمحہ لمحے سے بچھڑ جائے تو پھر دن ہو نہ رات
رات دن ہی جب نہ ہوں امروز و فردا کچھ نہیں

آسماں جب رات کو تاروں بھرا آئے نظر
تارے تارے کے تعاقب میں بکھر جائے نظر
کہکشاں تو پھر بھی کچھ ہے ایک تارہ کچھ نہیں

مذہبِ انسانیت میں جرم ہے فرق و تمیز
پیار خادم یار کا طاقت اخوت کی کنیز
بٹ لیا جائے تو رسی ورنہ دھاگا کچھ نہیں

نسلِ آئندہ کو ہم جینے کے قابل کر چلیں
آؤ پیاسو آؤ لہروں کی طرح مل کر چلیں
"موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں"

(۳ نومبر ۱۹۰۰ء)

خیر سگالی

آرٹ میرا فن
صورتیں میرا دھن
روشنی کی لگن
خوشبوؤں سا چلن
دوستی میرا کام
میرا دِل سب کے نام

خواہش امن کی وادیوں میں رہوں
مَیں تمدّن کی شہزادیوں میں رہوں
مَیں نقیبِ وفا
میری ہر سانس کا ہر نظر کو سلام
میرا دِل سب کے نام

دُوں صدا خُود کو ہر شخص کے اسم سے
میری پرچھائیں نکلے ہر اِک جسم سے
میرا دانش کدہ
آدمیت زدہ کشتۂ خاص و عام
میرا دِل سب کے نام

آئینے سارے ایک آئینہ گر کے ہیں
کیسا چھوٹا بڑا سب برابر کے ہیں
سارے سنسار میں
آؤ رائج کریں		سکۂ احترام
میرا دل سب کے نام

سب کے دل کی تہوں تک رسائی مری
اس رسائی نے دُنیا بسائی مری
ایک جاں ہے مگر
جانِ جاں کس قدر		رنگ مجھ میں تمام
میرا دل سب کے نام

بَیر کے راگ کی کوئی لے ہی نہیں
لفظ میری لُغت میں یہ ہے ہی نہیں
مَیں قلم کار ہُوں
سب کو درکار ہُوں		مُجھ پہ نفرت حرام
میرا دل سب کے نام

اے پاک سرزمیں کے خود دار بھائی بہنو
اپنی زبان بولو اپنا لباس پہنو

توڑو پرائے بندھن اپناؤ ڈھنگ اپنے
لہجے میں اپنی بو ہو تن پر ہوں رنگ اپنے
اپنی ادا سے مہکو اپنے چلن سے چمکو

اپنے اصول رکھنا اپنی ہی رائے رکھنا
دیوارِ زندگی پر اپنے ہی سائے رکھنا
اے آندھیوں کی زد پر جلتے ہوئے چراغو

جاگیں تمہاری آنکھیں اپنے ہی خواب لے کر
اور خواب اٹھے اک انقلاب لے کر
ہمراہِ وقت چل کر رفتارِ وقت بدلو

چلنا قدم مِلا کر دُنیا کی جِدّتوں سے
رِشتہ مگر نہ ٹُوٹے اپنی روایتوں سے
تارِیخ پھر تمھاری دُھرا رہی ہے تم کو

تنظیم سے عمل سے ایمان سے یقیں سے
اس خِطّۂ حسیں کی پہچان ہے تمھیں سے
یہ زندگی تمھاری تم اس کی زندگی ہو

چمکے گا نام کیسے اِس کے بنا تمھُارا
تم صُورتیں ہو اِس کی یہ آئینہ تمھارا
مٹی سے بھی تم اِس کی خوُرشید بن کے نِکلو

آزادی

لالہ ہستی کا معیارِ حنا بندی ہے
آزادی بھی اِک طرح کی پابندی ہے

رنگ اُڑے تو بول اُٹھیں بے لب تصویریں
ہم نے آج کے دِن توڑی تھیں سب زنجیریں
ٹوٹی ہوئی زنجیروں کی سہرہ بندی ہے

اِک قائد کو مانیں اِک دھرتی کو مانیں
ایک خدا پر ایماں ایک نبی کو مانیں
پھر بھی کیوں ہم لوگوں میں فِرقہ بندی ہے

جسموں کے اندر ہے سب کی جان برابر
اپنی نظروں میں سارے اِنسان برابر
ہم کیا جانیں کیا آقا ہے کیا بندی ہے

آؤ نرم ہواؤں کے جھونکے بن جائیں
پیار کی خوشبو لے کر دامن دامن جائیں
ایسے بکھرنے میں بھی شیرازہ بندی ہے

ہر ذرّہ اس دیس کا، میرا میت مظفر
میری سانسیں آزادی کے گیت مظفر
میری خاموشی کی آج صدا بندی ہے

سنگم

ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہوں
تاریخوں سے کرداروں سے
وقت کی اُونچی دِیواروں سے
اپنے اندر جھانک رہا ہوں
ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہوں

عظمتِ اِنساں نام تھا میرا
جہدِ مسلسل کام تھا میرا
حُبِّ الٰہی زیورِ جاں تھی
عشقِ نبی احرام تھا میرا
حسن اپنا خود مَیں نے چھینا
عکس نے توڑ دیا آئینہ
پہلے میں کیا تھا اب کیا ہوں
ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہوں

غیرت کو اِمداد میں تولوں
خُون میں اپنے کیچڑ گھولوں
مانگے کی آواز ہے میری
اپنے لہجے میں کیا بولوں
ہر لمحہ مجھ کو ٹھگتا ہے
سانس بھی لوں تو یوں لگتا ہے
جیسے قسط ادا کرتا ہُوں
ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہُوں

جہل کا دُشمن مذہب میرا
علم و ہُنر ہے منصب میرا
راہِ ترقی پر چلنے سے
کب مجھ کو روکے رب میرا
دین ہے خُود سائنس کا حامی
لیکن سوچیں ہوں اسلامی
مَیں بُقراط نہیں سِینا ہُوں
ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہُوں

میں سوؤں اور موسم جاگے
میں ساکت اور دُنیا بھاگے
کب پیچھے کی سمت مُڑوں گا
کب نکلوں گا سب سے آگے
حال تو میرا اِک رستہ ہے
جو ماضی سے وابستہ ہے
میں مُستقبل ہوں فردا ہُوں
ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہُوں

خوابوں سے پھُوٹے بیداری
لاوا اُگلے اب چنگاری
اب میری کھُلتی باہوں میں
دُنیا تے اِسلام ہے ساری
رحمتِ حق کا جس پر سایا
سرورِ دیں نے جو لہرایا
وُہ پرچم لے کر نکلا ہُوں
ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہُوں

ظرف سمندر نام ندی ہے
اس کا ہر دھارا اَبدی ہے
آنے والے لمحو سُن لو
یہ احیائے دیں کی صدی ہے
قرنِ اوّل کے پیاروں میں
عہدِ نبی کے سالاروں میں
نسلِ نو کو دیکھ رہا ہوں
ماضی و حال کے بیچ کھڑا ہوں

بازار

ایک مجبور کا تن بکتا ہے من بکتا ہے
اِن دُکانوں میں شرافت کا چلن بکتا ہے

سودا ہوتا ہے اندھیروں میں گناہوں کا یہاں
زندگی نام ہے ہستی ہوئی آہوں کا یہاں
زندہ لاشوں کے لِیے سُرخ کفن بکتا ہے

جھُوٹی اُلفت کے اشاروں پہ وفا رقص کرے
چند سکّوں کے چھنا کے پہ حیا رقص کرے
حُسنِ معصوم کا بے ساختہ پن بکتا ہے

بیچ کر اپنا لہو، آگ کمائی جائے
آبرُو قوم کی سِکّوں پہ لُٹائی جائے
سرِ بازارِ ہوس پیار کا فن بکتا ہے

اِنقلاب

"میرا نعرہ اِنقلاب و اِنقلاب"

میری سانسیں جادۂ شام و سحر

لمحہ لمحہ مجھ میں کرتا ہے سفر

میری دُنیا اضطراب و اضطراب

میرا نعرہ اِنقلاب و اِنقلاب

باخبر ہوں لاپتہ کیسے رہوں! خامشی کا ہمنوا کیسے ہوں

دھوپ میں کیسے ملے مجھکو نمی آگ کے اندر کھلا کیسے رہوں

جلتے گھر میں کس طرح چھیڑوں رباب

میرا نعرہ اِنقلاب و اِنقلاب

شاعری لفظوں کی عیاشی نہیں زخم افروزی ہے گلپاشی نہیں

ڈوبنا پڑتا ہے اپنے خون میں رنگسازی اور نقاشی نہیں

شاعرِ زندہ بھی ہوتا ہے عذاب

میرا نعرہ اِنقلاب و اِنقلاب

دیکھتا ہوں کس قیامت کے چلن　　چاندنی راتوں میں شعلے خیمہ زن
ڈولتے جھونکے ستونِ بام و در　　ٹوٹتے تارے چراغِ انجمن
زینتِ گلزار مرجھاتے گلاب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

زندگی نسلی درندوں کی مرید　　آدمیت صرف بہروں کی شنید
خود شناسی پاگلوں کا حسنِ ظن　　عقل و دانش جاہلوں کی زر خرید
ہر حقیقت ایک دہشت ناک خواب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

دردمندی کس بلندی پر ہے آج　　موت کرتی ہے مریضوں کا علاج
بادۂ زردار مزدوروں کا خون　　شربتِ فنکار زہرِ احتیاج
لقمۂ حالات غربت کا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

ذہنیت چالاک شکلیں مسخری　　تلخیوں کے لب پہ باتیں رس بھری
صاحبِ دل بے ضمیروں کا لقب　　خاکروبوں کا تخلص جوہری
روح بھی اب تو لگاتی ہے خضاب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

دوغلے یکتائی کا دعویٰ کریں | بلبلے گہرائی کا دعویٰ کریں
چار دیواری سے جو نکلے نہیں | بادیہ پیمائی کا دعویٰ کریں
قطرۂ شبنم بھی کہلاتے سحاب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

اِن فضاؤں کو تغیّر چاہیے | اور تغیّر میں تواتر چاہیے
بے حسی بے فکری بے ہمتی نہیں | فہم و اِدراک و تدبّر چاہیے
ورنہ مستقبل نہ ہوگا کامیاب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

زیرِ خنجر زیست دم لیتی نہیں | چاہِ نخوت کے قدم لیتی نہیں
آندھیاں رکتی نہیں فرمان سے | جبر سے نیکی جنم لیتی نہیں
کھینچنے سے ٹوٹ جاتی ہے طناب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

دلدلوں میں بن نہیں سکتے محل | ریت پر کھلتے نہیں دیکھے کنول
لوہا ڈھلتا ہے کہیں پگھلے بغیر | سوچ اگر بدلے بدل جائیں عمل
عینِ پس منظر ہو منظر کا نصاب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

آئینے میں ہو رُخِ آئینہ ساز　　ناز برداری کریں اربابِ ناز
گُل حقارت سے نہ دیکھے خار کو　　سنگ کو دی جائے تعلیمِ گداز
خُود ہی بن جائے گا ذرّہ آفتاب
میرا نعرہ اِنقلاب و اِنقلاب

(۲ر فروری ۱۹۷۹ء)

کربلا

لبوں پہ الفاظ ہیں کہ پیاسوں کا قافلہ ہے
نمی ہے یہ یا فرات آنکھوں سے بہہ رہی ہے
حیات آنکھوں سے بہہ رہی ہے
سپاہِ فسق و فجور یلغار کر رہی ہے
دِلوں کو مسمار کر رہی ہے

○

لہو لہو ہیں ہماری سوچیں
برہنہ سر ہے حیا، تمنّائیں بال نوچیں
وفا کے بازُو کٹے ہوئے ہیں
ہلاکتوں کے غبار سے زندگی کے میداں پٹے ہوئے ہیں
دُھواں، ہر اک خیمہ صدا سے نکل رہا ہے
ہر ایک اندر سے جل رہا ہے

○

ریا کے نیزوں پہ آج سچّائیوں کے سر ہیں
یزیدیت کے اصُول اپنے عروج پر ہیں
بڑی ہی ظالم ہے حق پسندی کہ چین لینے نہ دے یہ دُنیا
ہمیں تو کوفہ لگے یہ دُنیا
قدم قدم آزمائشوں کی فضا مِلی ہے
ہمیں تو ہر دَور میں نئی کربلا مِلی ہے

قحط الرّجال

آئینہ لے کر چلنے والو خود کو بھی پہچانو
ایک محبِّ وطن چاہیے آٹھ کروڑ انسانو

تم نے سالہا سال میں بولو کتنا سفر کیا ہے
بینائی کِس کام آئی خوابوں میں اگر کیا ہے
سانسوں کی رفتار کو قدموں کی رفتار نہ جانو
آٹھ کروڑ انسانو

آنے والا دَور لکھے گا کیا تاریخ تمھاری
اپنے ہی کانوں تک نہیں پہنچتی چیخ تمھاری
اپنے مطلب کے بھی تم ہُشیار نہیں دیوانو
آٹھ کروڑ انسانو

لمحہ لمحہ میزانِ کردار پہ تم کو تولے
اور حُسنِ کردار تمھارا زہر میں مصری گھولے
جل تو رہے ہو اندر سے اور چادر سر پر تانو
آٹھ کروڑ انسانو

زندہ قوموں کا شیوہ ہے ٹھوس عزائم رکھنا
آزادی سے مشکل آزادی کو قائم رکھنا
شام و سحر بھی ساتھ چلیں گے چلنے کی تو ٹھانو
آٹھ کروڑ انسانو

جس کو اپنا ہوش نہ ہو وہ سب کا قاتل ٹھہرے
حال پہ مرمٹنے والا جانِ مستقبل ٹھہرے
وقت کسی سے جھوٹا پیار نہیں کرتا نادانو
آٹھ کروڑ انسانو

روشنیوں کی دیواریں ہوں شیشے کا دروازہ
اندر کے انسانوں کا ہو باہر سے اندازہ
چہرے بھی سچ بولیں گے پہلے ذہنوں کو چھانو
آٹھ کروڑ انسانو

(۱۴ر اگست ۸۱ ء)

ذِمّہ دار کون

(ڈاکہ زنی میں ملوّث یونیورسٹی کے چند طلبا کی گرفتاری پر)

نسلِ نَو کی کج رَوی کا کون ذِمّہ دار ہے
کون ہے اِس گمرہی کا کون ذِمّہ دار ہے

سنگ زادو تم نے کیسے بُت تراشے دیکھ لو
پالنوں میں اپنے پوتوں کے تماشے دیکھ لو
حال کے کاندھوں پہ مُستقبل کے لاشے دیکھ لو
تم نہیں تو اِس گھڑی کا کون ذِمّہ دار ہے

کر رہے ہیں زندگی کی کِس طرح خانہ بُری
دھوپ بھی غیروں کی پیاری چھاؤں بھی اپنی بُری
اپنے ہاتھوں سے چلائیں اپنی گردن پر چھُری
اپنے ساتھ اِس دُشمنی کا کون ذِمّہ دار ہے

کیسے کیسے مادرِ تہذیبِ نَو کے لال ہیں
قد سے اُونچی ایڑیاں شانوں سے لمبے بال ہیں
شکل سے بے شکل ہیں اور حال سے بے حال ہیں
جاہلانہ بیہودگی کا کون ذِمّہ دار ہے

خُون کے آنسُو رُلاتے منظرِ نا دیدنی
علم و حکمت کی سند بھی داغِ پیشانی بنی
نونہالانِ وطن سیکھیں جہاں ڈاکہ زنی
ایسی یونیورسٹی کا کون ذِمّہ دار ہے

راہ چلتی لغزشوں کا خیر مقدم یہ کریں
اپنے اندر ھر برائی کو منظّم یہ کریں
اور نصیحت پر بڑوں کی طنزِ بیہم یہ کریں
اِرتقائے بے حسی کا کون ذِمّہ دار ہے

آج اپنی بے لگامی کا مچاتے ہیں جو شور
کل اُنھی کو تھامنی ہے مملکت کی باگ ڈور
کیا پچھاڑے گا کسی کو مرتعش ہاتھوں کا زور
آنے والی اَبتری کا کون ذِمّہ دار ہے

عالمِ نسواں بھی لڑکوں کے جہاں سے کم نہیں
گھر کی یہ عزّت بھی ننگِ خانداں سے کم نہیں
اِس گلستاں کی بہاریں بھی خزاں سے کم نہیں
آگ بنتی چاندنی کا کون ذِمّہ دار ہے

لڑکیوں کے سر سے چادر بے حیائی لے اُڑی
آنکھ کا پردہ ہوائے خود نمائی لے اُڑی
دُختر مشرق کو مغرب آشنائی لے اُڑی
اِس کھُلی آوارگی کا کون ذِمّہ دار ہے

رہ گئی ہے آج عورت اِشتہاروں کے لِیے
یا چمک سے نابلد فلمی سِتاروں کے لِیے
یا سرِ بازار جا بیٹھی ھزاروں کے لِیے
آخر اِس بے غیرتی کا کون ذِمّہ دار ہے

خُون اپنا ہے رگوں میں اور چلن مانگے کا ہے
رُوح اپنی جسم اپنا پیرہن مانگے کا ہے
چہرہ اپنا ہے زباں اپنی سخن مانگے کا ہے
شوقِ دریوزہ گری کا کون ذِمّہ دار ہے

چھوڑ کر سچائی دِلدادہ بناوٹ کا ہُوا
ہر نظر بہکی ہُوئی ہر ذہن ہے بھٹکا ہُوا
ہر کوئی خُود ساختہ سُولی پہ ہے لٹکا ہُوا
اِجتماعی خُودکُشی کا کون ذِمّہ دار ہے

جلنے والو کیا جیو گے زندگی ممکن نہیں
دِل ہوں جب تاریک گھر میں روشنی ممکن نہیں
قوم کیا، پھر فرد کی اصلاح بھی ممکن نہیں
سب اگر کہہ دیں کسی کا کون ذِمّہ دار ہے

درسگاہِ اوّلیں ہے سایۂ مادر پدر
اس کے بعد استاد ہے گہوارۂ علم و ہنر
اور پھر ہے فرض اپنے پیشواؤں کا، مگر
ایک عالم ہے سبھی کا، کون ذِمّہ دار ہے

(۴ر جولائی ۸۷ء)

اقبال اور ہم

شاہینِ قوم شاہِ سخن شاعرِ انا
تو چل بسا مگر ترے فن کو نہیں فنا

آوازِ حق بلند ہوئی تیرے ظرف سے
بُوئے رسُول آئے ترے حرف حرف سے

قرآں کا تیرے دل پہ تھا پانی چڑھا ہُوا
اور ذہن جیسے بحرِ معانی چڑھا ہُوا

صحرا کی وُسعتیں نظر آتی ہیں فرد میں
نظریں تری اَٹی ہیں ستاروں کی گرد میں

مِلّت کی بہتری ترے فن کو عزیز تھی
حق تیرا پیشوا تھا بصیرت کنیز تھی

دریائے خوں سے قوم کی کشتی گزار دی
سینے میں پتھروں کے حرارت اتار دی

چہرے جو تابناک تھے پھر زرد ہو گئے
تیری حرارتوں کے امیں سرد ہو گئے

ٹکرائی تھی خودی تری کوہِ حیات سے
ہم آج تک نکل نہ سکے غارِ ذات سے

تُو نے کہا کہ غیر کے آگے جھکے نہ سر
اپنی کسی کے سامنے اٹھتی نہیں نظر

تیرے لیے عظیم قلندر کی بارگاہ
اپنے لیے ہے زینۂ معراج پائے شاہ

تجھ کو حقیقتیں نظر آئیں مجاز میں
ہم کو ستائے فکرِ جہاں بھی نماز میں

تُو نے کہا فلک بشریت کی زد میں ہے
ہم نے کہا عروجِ بشر اس کی زد میں ہے

تُو اپنا خُونِ دل ، رگِ دَوراں میں بھر گیا
احساسِ زندگی بھی ہمارا تو مَر گیا

روشن ترے چراغ ہواؤں کے بام پر
ہم نے لگائے داغ خُود اپنے ہی نام پر

نغمے تری زباں پہ رہے اِتّفاق کے
اَور اپنی جھولیوں میں ہیں پتّھر نفاق کے

تری صدا کہ فرد کا مِلّت سے رَبط ہو
اپنی یہ کوششیں کہ ترا قول ضبط ہو

یہ خِطّۂ حسیں ترے خوابوں کی سرزمیں
اِس سرزمیں پہ جاگنے والا کوئی نہیں

کیسی ہو ضرب ، غرقِ مئے نوم کے لیے
اقبال کتنے چاہئیں اس قوم کے لیے

(۲)

دِلوں میں شاعرِ مشرق ضرور رہتا ہے
بصیرتوں سے مگر کتنی دُور رہتا ہے

کریں مطالعۂ اقبال کس قدر گہرا
شعور بھی پسِ تحت الشعور رہتا ہے

خودی سے اُس کی لیا درسِ بے خودی ہم نے
حواس اپنے گنوا کر سرُور رہتا ہے

وُہ اپنے خواب سے بیدار کر گیا ہم کو
ہمارا شیشۂ بینائی چُور رہتا ہے

انا میں اُس کی تکبّر کا شائبہ بھی نہ تھا
ہمیں نیاز پہ اپنے غرور رہتا ہے

نمائشوں میں رکھیں خلوتیں بھی ہم اپنی
ہمارا زُہد فنا فی الظہور رہتا ہے

نہیں ہے ایک شرربھی وجود میں اپنے
مگر مزاج سرِ کوہِ طور رہتا ہے

گِلہ تھا جس سے اُسے آج بھی وہ پیرِ حرم
خُدا کے سامنے، اپنے حضور رہتا ہے

عمل پہ جس کو اُبھارا تھا وہ زبان دراز
سخن کے پیڑ پہ مثلِ طیور رہتا ہے

بسائی اُس نے یقین و وفا کی پود جہاں
اسی چمن میں گروہِ فتور رہتا ہے

جو فکرِ غیر کے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھرے
کہاں وہ ذہن مظفرؔ غیور رہتا ہے

یومِ اقبال پر

یہ دِن ھمر کے استقبال کا دِن ہے
فرزندِ اسلام، خودی کے لال کا دِن ہے

وہ اِک شاعر جو خوابوں میں بھی جاگے تھا
جس کا پائے نظر تاروں سے بھی آگے تھا
اُس کے حوالے سے اپنی پڑتال کا دِن ہے

فرد نہ تھا جو اِک تحریک تھا ذات میں اپنی
جو مصروفِ عمل ہے تخلیقات میں اپنی
فن میں ڈوبنے والے اُس اقبال کا دِن ہے

فرمانِ شاہی سے کب سیلاب رُکے ہیں
شعبدۂ الفاظ کے موسم بیت چکے ہیں
تدبیروں کا فکر و استدلال کا دِن ہے

کاش خیالی طبقہ سوئے یقیں چل سکتا
یوم منا لینے سے کام نہیں چل سکتا
اپنے اپنے تجزیۂ اعمال کا دِن ہے

کب تک اپنے آپ ہنسیں گے چیخ پہ اپنی
آؤ غور کریں پوری تاریخ پہ اپنی
سمجھو آج کا دن چودہ سو سال کا دِن ہے

تھک گئیں آنکھیں مستقبل کو تکتے تکتے
دیکھ تو سکتے ہیں آگے تک جا نہیں سکتے
شیشے کی دیواروں جیسا حال کا دن ہے

ہمّت کا سفر

مایوس نہ ہو
وُہ دیکھ چمکتی راہگزار
کرنا ہے تجھے ہمّت کا سفر
فولاد کا دِل رکھ سینے میں
آئے گا مزہ پھر جینے میں
دریا کو چمن کو صحرا کو
قدموں پہ جُھکا لے دُنیا کو
مشہورِ جہاں ہو تیرا چلن
یُوں جُھوم کے چل رستے کی تھکن
محسُوس نہ ہو

سچائی ہو معیار ترا
آئینہ ہو کِردار ترا
جذبوں کی حرارت سرد نہ ہو
ماتھے پہ لہو ہو گرد نہ ہو
آہٹ سے تِری پتھر جاگے
اِمروز ہو فردا سے آگے
رکھ دے انگارے پُھولوں میں
روشن کر شمع بگُولوں میں
فانوس نہ ہو

نکلیں جو لوگ تیقّن سے
خُود کترائے مشکل اُن سے
دُکھ میں بھی ہنستے رہنا ہے
یہ دِل والوں کا گہنا ہے
بھرنے ہیں دُھوئیں میں رنگ تجھے
کرنی ہے ہوا سے جنگ تجھے
احرام زرہ سے ڈھانپ بدن
کمخواب و زری کا جانِ وطن
ملبوس نہ ہو

سنّاٹے نغمہ بار رہیں
نیندیں تیری بیدار رہیں
بیداری دیکھے سپنا بھی
کرنا ہے تعاقب اپنا بھی
اُجلا نہ ہو چاہے باہر سے
ہر سانس ہو روشن اندر سے
یہ روشنی ہے رستہ بھی ترا
اس رستے میں سایہ بھی ترا
جاسُوس نہ ہو

نذرِ قائد

وُہ حوصلہ تجھے ترے کردار نے دیا
رستہ ترے یقین کو دیوار نے دیا

حدِ نگاہ تیرے قدم چاٹتی رہی
تجھ کو خراج وقت کی رفتار نے دیا

بیداریوں کے آئینے میں جڑ دیا اسے
جو خواب تجھ کو ایک قلم کار نے دیا

کہسار کٹ گئے ترے لہجے کی دھار سے
تُو نے تو آندھیوں کو نہ دم مارنے دیا

دریا عبور کر گیا لہروں کو تھام کر
گہرائی کا پتہ تجھے منجدھار نے دیا

سایہ بھی تیرا ہم کو دکھاتا رہا چراغ
تجھ کو خطابِ ماہ شبِ تار نے دِیا

دشمن کے سر پہ تیری فراست کے زخم ہیں
یوں پیار کا سبق تری تلوار نے دِیا

پیاری ہے اُس کی خاک مظفرؔ کو جان سے
جو خطّۂ حسیں ترے ایثار نے دِیا

یومِ قائد پر

سچائیوں سے پیار سے نسبت نہیں ہمیں
غیرت ہے شوقِ عزت و عظمت نہیں ہمیں

قائد کے ہر اصول کا کرتے ہیں احترام
اُس پر مگر عمل کی ضرورت نہیں ہمیں

اوروں پہ اُنگلیاں تو اُٹھانے میں طاق ہیں
خود احتسابیوں کی مہارت نہیں ہمیں

کیا اپنے دشمنوں سے کریں گے مقابلہ
آپس کے اختلاف سے فُرصت نہیں ہمیں

سب اپنی اپنی ذات کے منبر نشین ہیں
احساسِ اجتماع و جماعت نہیں ہمیں

اللہ اور رسولؐ کے مُنکر تو ہم نہیں
اتنا ہے بس کہ شوقِ اطاعت نہیں ہمیں

ہر کوئی کیوں نہ خول چڑھائے ہُوئے ملے
شہرِ ہوا میں رہنے کی عادت نہیں ہمیں

پانی بھی اُس کا پیتے ہیں کھاتے بھی اُس کا ہیں
پھر بھی وطن سے اپنے محبّت نہیں ہمیں

جمہُوریت کی بات تو کرتے ہیں ہم مگر
اِس سلسلے میں ذوقِ مُتانت نہیں ہمیں

سعیِ نفاذِ شرع میں مخلص ہیں کِس قدر
اندازۂ زمانہ و مُدّت نہیں ھمیں

قائد کا صرف یوم منانے سے فائدہ؟
جب نام کو بھی پاسِ حمیّت نہیں ہمیں

ماضی، حال، مستقبل

یہ دِن وُہ قیمتی دِن ہے کہ جس دن میرے قائد نے
ہواؤں پر صداؤں سے وطن کا نام لِکّھا تھا

اُٹھے تھے اِک حسین آغاز کی جانب قدم اپنے
بہت دیرینہ جدّ و جہد کا انجام لِکّھا تھا

لکیریں کھینچ کر اِس مُلک کی دُنیا کے نقشے پر
ہری شاخوں سے اِک کھلتا ہُوا پیغام لکّھا تھا

تصوّر کو حقیقت کے دَر و دِیوار پہنا کر
دَر و دیوار کے سینے پہ اِستحکام لکّھا تھا

سرِ تاریخِ عالم، لَا اِلٰہ کی روشنائی سے
وطن کی سرزمیں کو خِطّۂ اسلام لِکّھا تھا

ہوائے خِطّۂ اسلام کچھ ایسے لپٹتی تھی
ہر اِک جھونکے کو اُس کے جامۂ احرام لِکّھا تھا

خُدا کی رحمتوں کی ہر طرف شیرینی بٹتی تھی
فضائے پاک پہ لفظِ محبّت عام لکّھا تھا

ہمارے ہاتھ میں جب اس وطن کی باگ ڈور آئی
تو ہم نے اس کے دامن اس کی پیشانی پہ کیا لکھا

رکیے کتنے سمندر پار، کتنے دشت ٹھکائے
رکیا کیا ریت پر ہم نے رقم، پانی پہ کیا لکھا

ہمارے پاس بھی تو خامۂ انصاف تھا ہم نے
خود اپنی بے حسی پر، اپنی نادانی پہ کیا لکھا

چڑھا دریا تو ساحل سے تماشہ کر لیا ہم نے
شکستہ کشتیوں پر، زدِ طغیانی پہ کیا لکھا

اگر جھوٹے نہ تھے دعوے ہماری صاف گوئی کے
تو صبرِ قوم پر اور جبرِ سلطانی پہ کیا لکھا

جو ہم بے داغ تھے تو کیوں نقابیں ڈال کر نکلے
جو نظریں تھیں تو آئینوں کی حیرانی پہ کیا لکھا

اگر عیار تھے اعلانِ عیاری بھی کر دیتے
اگر دیندار تھے تو قدرِ ایمانی پہ کیا لکھا

چلو اُس جگمگاتے راستے سے دوستی کر لیں
جو سچائی دیانت اور وفا کی سمت جاتا ہو

جہاں انسانیت سے بُو نہ آتی ہو تعصب کی
جہاں ہر آدمی اِک دُوسرے کا دُکھ بٹاتا ہو

جہاں پتھر کو توفیقِ عمل دیتی ہوں تدبیریں
جہاں بھونچال بھی تعمیر کے کرتب دکھاتا ہو

جہاں ہر فاصلہ آ کر لپٹ جاتا ہو قدموں سے
جہاں ایک ایک لمحہ بوجھ صدیوں کا اٹھاتا ہو

جہاں آوازِ پائے مصطفٰےؐ کی رہنمائی میں
ہر اِک سایہ خُدا کے نُور سے آنکھیں ملاتا ہو

جو صدیوں بعد کا فردا رہے اپنی نگاہوں میں
تو چودہ سو برس پہلے کے ماضی سے بھی ناتا ہو

وطن پیارے وطن اور دین سچّے دین کی خاطر
ہمیں جینا بھی آتا ہو ہمیں مَرنا بھی آتا ہو

پاگل

میں سوچوں کے شہر کا باسی
خوابوں سی گلیوں میں صدا لگانے والا
اپنے پیچھے اپنا سایا لگانے والا

میری آنکھیں پیاسی پیاسی
چہرہ چہرہ پیتہ حسن کا لگانے والا
پتھر کے ہاتھوں پر حنا لگانے والا

میرا روگ ہے فرض شناسی
خاک میں روشنیوں کا پودا لگانے والا
میلی دنیا کو غم اُجلا لگانے والا

کون کرے میری عکاسی
میں اپنے ہی خون میں غوطہ لگانے والا
رُوح کی گہرائی کو دھڑکا لگانے والا

تغیّر

لوگو جو بدلنا ہے خیالات کو بدلو
آئینے نہ تبدیل کرو، ذات کو بدلو

خود ساختہ آزادیوں میں قید ہو کب سے
تم سامنے ہوتے ہوئے ناپید ہو کب سے
جن سے ہو زیاں ایسے مفادات کو بدلو

جس قوم کو احساسِ تغیّر نہیں ہوتا
اُس قوم کا کوئی بھی خلا پُر نہیں ہوتا
کچھ اور، بدلتے ہوئے حالات کو بدلو

اس پاک زمیں پر نظر آئیں گے نہ کوفے
پتھر سے بھی پھوٹیں گے محبت کے شگوفے
موضوعِ علاقائی و طبقات کو بدلو

زنجیرِ تضادات ہے پیروں میں تمہارے
رہتے ہو یہاں ذہن ہیں غیروں میں تمہارے
لہجہ بھی بدل جائے گا جذبات کو بدلو

فرداؤں کی بنیاد تمھیں آج ہے رکھنی
قائد کے اصولوں کی اگر لاج ہے رکھنی
اوقات کو بدلو بسر اوقات کو بدلو

دے دینا ہے سر، ریت پہ سپر ہی نہیں کرنا
رستہ بھی بنانا ہے، سفر ہی نہیں کرنا
لکھو نئی تاریخ، حکایات کو بدلو

سوچا بھی کہ محروم اثر کیوں ہیں دعائیں
آداب دعا ہی تمھیں در اصل نہ آئیں
خالق کو نہیں طرزِ مناجات کو بدلو

دیتا ہے صدا تم کو محمدؐ کا زمانہ
پیچھے کی طرف دوستو ہو جاؤ روانہ
اس عہدِ ترقی کی روایات کو بدلو

قائد کا پیغام

ساری قوم کے نام
قائد کا پیغام
کام کام بس کام

کام ہے وہ تلوار
کاٹے جو کہسار
کام ہی ایسا پھول
جو ہے سدا بہار
کام سے جس کو پیار
اُس کا وقت غلام — قائد کا پیغام
کام کام بس کام

راتوں کو بھی جاگ
جاگیں تیرے بھاگ
شبنم پر حق اُس کا
جس کے اندر آگ
محنت بھی اِک راگ
گائے جا ہر گام — قائد کا پیغام
کام کام بس کام

گرم رہے جو خُون
دِل کو آئے سکون
کام پکارے سب کو
مرد ہو یا خاتون
قدُرت کا قانون
قدُرت کا اِنعام — قائد کا پیغام
کام کام بس کام

جو تھک کر ہو چوُر
پھوُٹے اُس سے نوُر
دفتر ہوں یا کھیت
ہم سب ہیں مزدُور
اپنا اِک منشوُر
اپنا ایک نظام — قائد کا پیغام
کام کام بس کام

جمہور کے نقیبو

دامن پہ داغ لے کر
کالے دماغ لے کر
نکلے ہو پھر رقیبو
جمہور کے نقیبو

جمہوریت تمھاری
برسوں رہی ہے طاری
ہر ہاتھ تھا لٹیرا
ہر ذہن تھا شکاری

تم ہو کھلی کتابیں
ڈالو نہ اب نقابیں
اے جعفرو مجیبو
جمہور کے نقیبو

جلّاد تھے وڈیرے
جذبے اُٹھائی گیرے
ہر تن پہ زخم ٹانکا
اپنی قبا پہ ہیرے
اِس مُلک کا خزانہ
میراث تم نے جانا
اے لکھ پتی غریبو
جمہُور کے نقیبو

شُعلوں سے نیر باندھے
جھونکوں سے تیر باندھے
زنجیرِ تیرگی سے
روشن ضمیر باندھے
جھانکو تو اپنے اندر
اِنسانیت کے سر پر
لٹکی ہوئی صلیبو
جمہُور کے نقیبو

تم نے تو آئینوں کی
آنکھوں میں دھول جھونکی
سچائیوں کو روندا
باطل کی پیٹھ ٹھونکی
کی جس نے نکتہ چینی
گویائی اُس سے چھینی
اے سنگ دل خطیبو
جمہور کے نقیبو

جو بھی گیا جدھر کو
لوٹا نہ پھر وہ گھر کو
منزل سے تم نے کاٹا
ہر ایک رہگزر کو
پھولوں سے پیار جھوٹا
تم نے چمن کو لوٹا
خونخوار عندلیبو
جمہور کے نقیبو

اعلانِ پارسائی
کرنے چلی برائی
گمراہیوں کے لب پر
ہے درسِ پیشوائی

اِنصاف دانت پیسے
مرہم رکھو چھُری سے
قاتل نظر طبیبو
جمہور کے نقیبو

کشمکش

ساحلوں پہ ہیں بھنور — راستوں میں گرد ہے
سب غلامِ حرص ہیں — کون حق نورد ہے
لب پہ ہیں حرارتیں — خُون رگوں میں سَرد ہے
ملک اور قوم کا — کِس کے دِل میں درد ہے
کِس کو رہ نما کہیں

شہسوار وہ نہیں — یا فرس بدل گئے
غم گسار بچھڑ گئے — بوالہوس بدل گئے
ہم نوا بہک گئے — ہم نفس بدل گئے
لوگ تو وُہی رہے — نام بس بدل گئے
دُھوپ کو گھٹا کہیں

اپنی اپنی ڈفلیاں — اپنا اپنا راگ ہے
دامنوں میں پھول ہیں — خواہشوں میں آگ ہے
روشنی بھی ہے دُھواں — شاخ شاخ ناگ ہے
بے حِسوں کے ہاتھ میں — زندگی کی باگ ہے
موت کو بقا کہیں

ہمسفر کے بھیس میں
پردۂ خلوص میں
زیست کی فصیل پر
کم نگاہ نقد گر
گامزن رقابتیں
جلوہ گر خباثتیں
مرمریں عمارتیں
تنگ دِل سیاستیں
تجسّس کو ہوا کہیں

آشنا بکف سہی
اپنی اپنی شخصیت
ہر دروغ کار کو
دستِ اِتحاد ہیں
ذہن کس کا صاف ہے
مرکزِ طواف ہے
سچ کا خوں معاف ہے
زہرِ اختلاف ہے
اِس رَوِش کو کیا کہیں

داد خوش نوائی کی
ڈھول کی مثال ہیں
صُورتیں ہیں روغنی
کھوٹ اپنے ذہن میں
یار ہے ہیں بے سُرے
آدمی بھرے پُرے
اور ضمیر کھُردرے
دِل کے آپ ہیں بُرے
وقت کو بُرا کہیں

دیکھیے تو آشنا
سوچیے تو اجنبی
جتنے ہوشیار وہ
ہم اُسی قدر غبی
ہم بلا کے بے غرض
وہ غضب کے مطلبی
مصلحت کی زد میں ہے
آج فرضِ منصبی
مکر کو وفا کہیں

بے وقوف تابکے
ہم بنیں گے دوستو
عقل سے بھی کیا کبھی
کام لیں گے دوستو
زندہ قوم کی طرح
کب اٹھیں گے دوستو
جادۂ اصول پر
کب چلیں گے دوستو
چُپ کو ہم صدا کہیں

(۱۲ رمئی ۱۹۷۸ء)

خُود اَسیری

سفر کون سمجھے ہمارے سفر کو
ہوا ہے کدھر کی چلیں ہم کدھر کو

اندھیروں میں دفنا دیا نُور ہم نے
کیا عیب پوشی پہ مامُور ہم نے
فراست کو بینائیوں کو ہُنر کو

عجب طرز کی ہے یہ خُود آگہی بھی
کہ ہے ہمرہِ جستجو گمرہی بھی
نہ منزل کو پہچانتے ہیں نہ گھر کو

اُلجھنے لگیں دُوریوں سے نگاہیں
نئے موڑ پر جا نکلتی ہیں راہیں
غلط آپ ہیں کوستے ہیں خضر کو

یہ احساس و جذبات کی بے لبیری
کہ ہے اِس قدر قحطِ روشن ضمیری
اُجالا ہے لیکن پکاریں سحر کو

ہماری بصیرت پہ ہر عہد رویا
ہماری رعونت نے ہم کو ڈبویا
سفینہ سمجھتے رہے ہر بھنور کو

قدآور بنے اور تھے بالشتیے ہم
پریشاں رہے پگڑیوں کے لیے ہم
بچایا نہ ہم نے کبھی اپنے سر کو

کہے بسترِ مرگ کو بھیج یارب
اب اِس قومِ بیمار میں بھیج یارب
کسی ابنِ مریم کسی چارہ گر کو

(۷ر جولائی ۸۷ء)

کام کر کام کر

بندۂ محترم
رکھ ہوا پر قدم
وقت سے ڈھنگ لے
زخم سے رنگ لے
حوصلے عام کر
کام کر کام کر

بے عمل زندگی بھی ہے کچھ زندگی
صرف کہنے سے چھٹتی نہیں تیرگی
جگمگاتا نکل
روشنی میں بھی چل
مشعلیں تھام کر
کام کر کام کر

رقص کیسا یہ جذبات کی تھاپ پر
پکتے دیکھے ہیں پھل بھی کہیں بھاپ پر
خود پہ ضرب میں لگا
غیرتوں کو جگا
اب نہ آرام کر
کام کر کام کر

کیا رگوں میں بھی جسم کی لہو رہ گیا
کتنا پیچھے زمانے سے تو رہ گیا
چھوڑ بھاگے ہیں جو
تجھ سے آگے ہیں جو
طے وہ ایام کر
کام کر کام کر

کھول دیں اپنی باہیں تمناؤں نے
تجھ کو چاہا ہے کتنی زلیخاؤں نے
دیکھ حالات کو
یوسفِ ذات کو
چل کے نیلام کر
کام کر کام کر

موجِ طوفاں سنبھالے سفینہ ترا
سورجوں کو اجالے پسینہ ترا
دل ہے احساس ہے
جو ترے پاس ہے
قوم کے نام کر
کام کر کام کر

معاشرہ

مرے وطن کے باسیو
جیو تو اِس طرح جیو
کہ زندگی خراج دے
دُعا تمھیں سماج دے
یہ راستے کے پیچ و خم
چلو تو چُوم لیں قدم
ہر اِک گھڑی کا پیار لو
معاشرہ سِدھار لو

یہ وقت کھو رہے ہو تم
جو فصل بو رہے ہو تم
کسی کو کاٹنی بھی ہے
یہ آگ چاٹنی بھی ہے
حواس کس کو دے دیے
نہ اپنی نسل کے لِیے
تباہیاں اُدھار لو
معاشرہ سدھار لو

نہیں یہ تم سے ماورا
تمھیں تو ہو معاشرہ
نظر کے سامنے جو ہے
تمُھارا عکس ہی تو ہے
غبار بھی بنے حِنا
چمک اُٹھے یہ آئینہ
جو خُود کو تم سنوار لو
معاشرہ سدھار لو

بھرو گے دم جو خیر کا
نِشاں مٹے گا بیَر کا
بنو گے ملّتِ قوی
کرو سلف کی پیروی
چلو رہِ یقین پر
بہشت ہو زمین پر
خُدا نبی کا پیار لو
معاشرہ سدھار لو

صداقتوں کا ساتھ دو
بُرائیوں کو مات دو
جہاد ہو ہر اِک عمل
ملے گا نیکیوں کا پھل
سبھی اگر سُدھر گئے
تو سمجھو پار اُتر گئے
بَھلائی کا رُوپ دھار لو
معاشرہ سدھار لو

ہر اِک جبیں ہو خندہ زَن
شکر فرِوش ہو سخن
نظر حیا پرست ہو
خلوص، دِل بدست ہو
کماں بنو جو تیر سے
صدا اُٹھے ضمیر سے
اَنا سے اِنکسار لو
معاشرہ سِدھار لو

عالمی سوداگر

اے عالمی سوداگرو
منڈی تمھاری کُل جہاں
مالِ تجارت جسم و جاں
سودے ضمیروں کے کرو
اے عالمی سوداگرو

ہریالیوں کے بھاؤ دو شعلے سنہرے رنگ کے
کھولو دکانیں امن کی سامان بیچو جنگ کے
مقتل لگے بازار بھی
دشمن بھی ہو تم یار بھی
اے آستیں کے خنجرو
اے عالمی سوداگرو

مغرب کی دولت سے کرو مشرق میں ٹھیکیداریاں
اِس پار بھی پھیلاؤ تم اُس پار کی عیاریاں
ہنس ہنس کے بخشو غم اسے
لینے نہ دو تم دم اُسے
جس کا بظاہر دم بھرو
اے عالمی سوداگرو

چوروں کے بھی ہمدرد تم اور ہمنوا شاہوں کے بھی
ہو دشمنِ جاں کس قدر اپنے بھی خواہوں کے بھی
کتنے ہو پُر اسرار سے
بانہیں بڑھاؤ پیار سے
اور پاؤں سینے پر دھرو
اے عالمی سوداگرو

ہر ملک کے حالات سے کرتے ہو کانا پھوسیاں
نکلو تعاون کے لیے کرتے پھرو جاسوسیاں
پہلے لگاؤ آگ تم
پھر گاؤ ٹھنڈے راگ تم
بیداد گر چارہ گرو
اے عالمی سوداگرو

جس سے اُگیں سچائیاں وُہ بیج بو سکتے نہیں
اپنے سے چھوٹوں کے کبھی تم دوست ہو سکتے نہیں
بانٹو عناد اپنا سدا
دیکھو مفاد اپنا سدا
اے کور دِل دِیدہ ورو
اے عالمی سوداگرو

لیتے ہیں موسم کروٹیں اِک انقلاب آنے کو ہے
جاگی ہے دُنیا تیسری روزِ حساب آنے کو ہے
بیدار اب حق ہو چلا
رنگِ ستم فق ہو چلا
انجام سے اپنے ڈرو
اے عالمی سوداگرو

(۱۲ مارچ ۷۹ء)

القدس

شہرِ مرے قبلۂ اوّلیں میں آ رہا ہوں
متاعِ ایماں اثاثۂ دیں میں آ رہا ہوں
شہرِ فلسطیں میں آ رہا ہوں

گزر رہا ہوں بڑے ہی دشوار مرحلوں سے
کچھ امتحاں لے رہا ہے پروردگار میرا
اسے بھی مقصود ہے یقیناً مری بھلائی
بدل رہا ہے نصابِ لیل و نہار میرا
کچھ اور کر انتظار میرا

میں اپنی صدیوں پرانی تاریخ سے بچھڑ کر
بہت سے جغرافیائی خانوں میں بٹ گیا تھا
میں دائرے کی طرح کھلی وسعتوں کا عادی
حقیر نقطے کی تنگیوں میں سمٹ گیا تھا
میں اپنے مرکز سے ہٹ گیا تھا

میں زندہ تھا بے حسی کی تاریک وادیوں میں
میں سوچتا تھا شعور کی مشعلیں بجھا کر
میں بولتا تھا مگر نہ تھا کوئی لفظ میرا
میں دیکھتا تھا مگر پرائی نظر لگا کر
تھا مطمئن اپنا پن گنوا کر

نہ دھوپ پر کوئی حق تھا میرا نہ چاندنی پر
نہ میرے اندر کسی بھی گوشے میں روشنی تھی
میں سانس تو لے رہا تھا لیکن اجازتوں سے
مری ہوئی روح تن کے تابوت میں سجی تھی
عجیب پتھر کی زندگی تھی

مگر اچانک فدائیوں کے لہو کی چھینٹیں
اُتر گئیں دل میں زہر آلود تیر بن کر
پلا دیا ہو کسی نے آبِ حیات جیسے
اُٹھا میں روشن دماغ روشن ضمیر بن کر
محبتوں کا سفیر بن کر

صدائیں آنے لگیں جرس کی سی دھڑکنوں سے
میں اپنے ماضی کی سمت بھاگا، پلٹ کے آیا
نہ میں ہی پہلا سا تھا نہ پہلے سے تھے مناظر
گیا اکیلا تھا واپسی پر میں ساتھ لایا
نبی کی رحمت خدا کا سایا

یہود دیو جان لو کہ اب میں کئی گنا ہوں
تمام امّتِ رسول کی اب ہے ساتھ میرے
جہاد پر تم ہی مجھ کو مجبور کر رہے ہو
تمھاری جانب اب اُٹھنے والے ہیں ہاتھ میرے
غلام ہیں شش جہات میرے

میں یوں تو بے تیغ بھی ہوں میداں میں لڑنے والا
کچھ اسلحہ بھی خدا سے مل کر بنا رہا ہوں
حق و صداقت کے ٹینک صبر و رضا کے راکٹ
یقیں کی توپیں صفا کے بکتر بنا رہا ہوں
عظیم لشکر بنا رہا ہوں

شہر مرے قبلۂ اوّلیں میں آ رہا ہوں
متاعِ ایماں اثاثۂ دیں میں آ رہا ہوں
شہر فلسطیں میں آ رہا ہوں

(۲۳ ستمبر ۸۰ء)

افغان جل رہا ہے

تہذیب کے حواری
تہذیب سے ہیں عاری
اِنسان ہی کے ہاتھوں اِنسان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

پھر دشمنانِ دیں نے مسلم پہ جال تانے
اِمداد کے بہانے آئے زمیں چرانے
اندازِ خیر خواہی
بربادی و تباہی
گھر سے ہیں لوگ بے گھر سامان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

ڈھونگ اِشتراکیت کا بھروپ ہے رچائیں
لاشوں پہ بیکسوں کی اپنے محل بنائیں
اُجڑی ہوئی ہیں گلیاں
شعلہ بکف ہیں کلیاں
کھیتوں سے آگ پھوٹے دہقان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

ہریالیوں پہ کالک سُرخ آندھیوں نے پھیری
ٹکرائے دہریت سے اِسلام کی دلیری
یہ اِمتحاں ہے سب کا
یا صرف اہلِ رب کا
الحاد شُعلہ زن ہے ایمان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

دُنیا کی عدلیہ میں جو سچ کے ترجماں ہیں
اَمن و سلامتی کے وُہ دیوتا کہاں ہیں
انصاف کی دُہائی
دیتی ہے بے نوائی
روتی ہیں آرزوئیں اَرمان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

احساس کیوں ہے مُردہ سکتہ ہے کیوں قلم پر
اہلِ سخن بھی چپ ہیں کیوں اس کھُلے سِتم پر
خُود کو ذرا کُریدیں
خیراتِ فن ہی دیدیں
خُوں میں ہیں لفظ غلطاں عنوان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

دشنام دکور یا سے یہ جنگ کم نہیں ہے
غیروں کی تھی وہ دھرتی اپنوں کی یہ زمیں ہے
غیروں کی جی حضوری
اپنوں سے اتنی دوری
نارِ منافقت میں کیوں دھیان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

ہاتھوں میں جو ہمارے رسی خدا کی ہوتی
یوں خاک میں نہ رُلتے تسبیحِ دیں کے موتی
رُخ ہے عجب سزا کا
یارو غضب خدا کا
اللہ اور نبی کا فرمان جل رہا ہے
افغان جل رہا ہے

(۴ اپریل ۸۰ء)

دُہری جنگ

یہ جنگ ہماری جنگ بھی ہے

افغان بھی بھائی ہیں غیر نہیں
وُہ مٹے تو اپنی خیر نہیں
اِس خُون میں اپنا رنگ بھی ہے
یہ جنگ ہماری جنگ بھی ہے

دو مُلکوں کی یہ جنگ نہیں، یہ جنگ ہے حق و باطل کی
الحاد تباہی چاہتا ہے، حق والوں کے مستقبل کی
افغانستان کی سرحد پر
ہر ایک مُسلماں ہے زد پر
دُنیا اب دِین پہ تنگ بھی ہے
یہ جنگ ہماری جنگ بھی ہے

تاریکی شب سے رنگ لڑیں خوشبوئیں آگ کے سنگ لڑیں
ہر سلطنتِ اسلامی کی وہ اپنے وطن میں جنگ لڑیں
توپوں، تیروں، شمشیروں میں
ان غازیوں کی تکبیروں میں
شامل اپنا آہنگ بھی ہے
یہ جنگ ہماری جنگ بھی ہے

دشمن جابر مکار سہی اور اپنے بھی غدار سہی
مظلوم نہیں دبنے والا طاقت ظالم کی بار سہی
جب مشکل وقت ہو اُمّت پر
مر جانے اپنی عزّت پر
جینے کا اِک یہ ڈھنگ بھی ہے
یہ جنگ ہماری جنگ بھی ہے

اِک بھائی گھرا ہے شعلوں میں اِک بھائی ہے رقصاں خوشبو پر
باتیں تعمیر و ترقّی کی، سر لہو و لعب کے زانو پر
حالات کو ہم پہچانیں بھی!
گو نجیں مسجد میں اذانیں بھی!
محفل میں رباب و چنگ بھی ہے
یہ جنگ ہماری جنگ بھی ہے

خورشید صفت فنکار بھی ہیں چہروں پر خول چڑھائے ہوئے
تصویریں ہیں دُھندلائی ہوئی آئینے ہیں پتھرائے ہوئے
سوچوں کے پر رکھنے والا
لمحوں پہ نظر رکھنے والا
بے حس بھی ہے اور دنگ بھی ہے
یہ جنگ ہماری جنگ بھی ہے

مردِ افغان سے

مردِ کہسار سُن
آگ سے پھول چُن
خم نہ ہو سر ترا
دُشمنوں پر ترا ـــــ خوف طاری رہے
جنگ جاری رہے

دیکھ لے تیرا سہرہ بھی وادی تری
ہو عروسِ شہادت سے شادی تری
چاہتا بھی ہے تو
پھر تری آرزو
کیوں کنواری رہے
جنگ جاری رہے

نعرۂ حق لگا جھوم کر چیخ کر
اپنے خوں سے رقم ایسی تاریخ کر
قوم قربان ہو
وقت حیران ہو
دنگ قاری رہے
جنگ جاری رہے

تو علامت ہے غیرت کی ایثار کی
جن درندوں نے بھی تجھ پہ یلغار کی
اُن پہ بھاری رہا
تو شکاری رہا
تو شکاری رہے
جنگ جاری رہے

تجھ سے کتنا ہی دشمن قوی ہے ترا
نام ابدالی و غزنوی ہے ترا
اے مرے بت شکن
تجھ کو خاکِ وطن
جاں سے پیاری رہے
جنگ جاری رہے

بس نہ جائیں مکینوں سے جب تک مکاں
لوٹ جائیں نہ جب تک یہ سُرخ آندھیاں
خُون کی مشعلیں
قریہ قریہ جلیں
شعلہ باری رہے
جنگ جاری رہے

پھر ترا راج ہوگا زمیں پر تری
فتح لکھی ہوئی ہے جبیں پر تری
حق پہ تو ہے فدا
رحمتِ کبریا
تجھ پہ واری رہے
جنگ جاری رہے

(۲۱ مارچ ۸۲ء)

رُوس اور امریکہ

کھیل کھیل میں کتنی بستیاں اُجاڑی ہیں
اِس بساطِ عالم کے دو فقط کھلاڑی ہیں
اور سب اَناڑی ہیں

خِطّہ ضروری ہو یا مقام بھرتی کا
دِل میں درد رکھتے ہیں اب تمام دھرتی کا
رُوس اور امریکہ

اپنی وسعتوں سے بھی کٹ کے رہ گئی دُنیا
صرف چار ہاتھوں میں بٹ کے رہ گئی دُنیا
گھٹ کے رہ گئی دُنیا

دِل سکندری اُن کا اُن کی جیب قارُونی
اُن کے ویٹو کی رُو سے دھاندلی بھی قانونی
قتل سے بری خُونی

وحشیانہ جذبوں کو داخلِ خرد کرنا
صرف اُن کا حِصّہ ہے سچ کو مسترد کرنا
ظلم کی مدد کرنا

ظاہری تو دونوں میں اختلاف ہے لیکن
ایک دُوسرے کے ہیں وُہ بہت بڑے محسن
ایک جیسا ہے باطن

دونوں ہی مانندے اپنی بے پناہی کے
اپنی اپنی لَے میں گائیں گیت خیر خواہی کے
ساز پر تباہی کے

پیش پیش رہتے ہیں ظلم کرنے والوں میں
بھیڑیے ہیں پوشیدہ آدمی کی کھالوں میں
آگ ہے اُجالوں میں

زندگی کے بارے میں مشورے قضا سے ہیں
خونِ بے گناہی کے اصل میں یہ پیاسے ہیں
نُطفۂ جفا سے ہیں

کچھ نتیجۂ مثبت کس دہائی کا نکلا
عالمی اِدارہ بھی کتنا بے نوا نکلا
سب ڈھکوسلا نکلا

سانپ ہیں جہالت کے عِلم کے خزانے پر
لاشۂ تمدّن ہے اِرتقا کے شانے پر
تُف ہے اِس زمانے پر

اپنے اپنے رستے ہیں اپنے اپنے مطلب ہیں
دُوسروں سے کیا شکوہ ہم بھی متّحد کب ہیں
ہم بھی مار د عقرب ہیں

حرفِ دوستی ہم پر قہقہے لگاتا ہے
دوستوں سے بھی اپنا دُشمنی کا ناتا ہے
پیار کس کو آتا ہے

سُرد مہرباں یارو آگ ہی نہ بھڑکا جائیں
آستنوں سے ہم اپنے آپ ہی نہ ٹکرا جائیں
ہم تو ہوش میں آجائیں

وقت کا تقاضا ہے آنکھ ہم کھُلی رکھیں
شوقِ زندگی رکھیں ذوقِ آگہی رکھیں
دِل میں روشنی رکھیں

عہدِ وفا

تو ہماری انا
تو نہ ہوگا فنا
ترے کہلائیں ہم
تجھ کو پہنائیں ہم
زیورِ جان و تن
اے وطن اے وطن

ماہ و انجم ترے راستوں میں جلیں
تیرا دامن پکڑ کر ہوائیں چلیں
رنگ چہرہ ترا
نور سایہ ترا
خوشبوئیں پیرہن
اے وطن اے وطن

کوہساروں کا ملبوس ہریالیاں
کھیت، سونے کی پہنے ہوئے بالیاں
دھوپ بھی چھاؤں سی
ریت دریاؤں سی
موجِ طوفاں کرن
اے وطن اے وطن

تیرے شاہیں کے چومے قدم آسماں
سرحدوں کی فصیلیں ترے نوجواں
تیرا ہر اک جری
قاسم و غزنوی
فاتح و بُت شکن
اے وطن اے وطن

سازشی خوش ہیں بازو ترا کاٹ کر
زہر اُگلتے ہیں تیرا لہو چاٹ کر
لاکھ ہوں مطمئن
آئے گا وہ بھی دن
روئیں گے مکر و فن
اے وطن اے وطن

خون تو مِٹ بھی سکتا ہے دیوار سے
کہیں پانی بھی کٹتا ہے تلوار سے
جو ہوئے ہیں جُدا
پھر کرے گا خُدا
ایک دِل دو بدن
اے وطن اے وطن

جو اَبد کی طرف تجھ کو جانے نہ دے
اپنی باگوں پہ وہ ہاتھ آنے نہ دے
تیرا حق کیوں پرے چھنے
چھانٹ لے آئنے
پتھروں کا نہ بن
اے وطن اے وطن

میرا اعزاز تو میری اُمّید تو
میرا مہتاب تو میرا خُورشید تو
تیری کرنیں ستوں
تجھ کو لگنے نہ دُوں
لغزشوں کے گہن
اے وطن اے وطن

کس کی ہمت ہے جو وار تجھ پر کرے
روند ڈالوں، جو یلغار تجھ پر کرے
کھیل میرا وغا
موت میری ادا
میری وردی کفن
اے وطن اے وطن

فکر زادے محاذوں کے راہی بھی ہیں
صرف شاعر نہیں ہم سپاہی بھی ہیں
وقت آیا اگر
ہو گا سینہ سپر
تیرا ہر اہلِ فن
اے وطن اے وطن

(۲ جنوری ۷۳ء)

بچّے

بچّے قوموں کا مستقبل تہذیبوں کا سایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

بچّے ہر دھرتی پر اُگنے والی ایک سی فصلیں
بچّوں کے حق یکساں کیسا رنگ کہاں کی نسلیں
سارے بچّے پیار کے راجہ کی معصوم رعایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

دِن میں سُورج ہوں گے چاند سی صورت رات میں ہوگی
آئندہ کی ڈور انہی بچّوں کے ہات میں ہوگی
بچّے آنکھوں کا اجیارا بچّے ٹھنڈی چھایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

بچّوں کا پیدائشی حق ہے بڑوں سے شفقت لینا
جرم ہے اور سنگین جُرم ہے ان سے محنت لینا
بچّے تو خوشبو ہیں، خوشبو نے کب بوجھ اُٹھایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

دُنیا کو ظالم ٹھہرائیں تو کیا نہیں وُہ بچّے
ساری خُوشیوں سے محروم ہیں تین سو ملین بچّے
کیوں اے دُنیا تُو نے اتنے چاندوں کو گہنایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

مُفلس بچّے بھی کب صحت کا شہکار بنیں گے
سارے بچّے کب علم و فن کے حقدار بنیں گے
کب اِن ننّھے پھُولوں کی پلٹے گی کایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

بھُوک تو ایک ہی جیسی لگتی ہے سارے بچّوں کو
اِک ٹکڑا بھی نہیں میسّر جن پیارے بچّوں کو
اُن بچّوں کا قرض ہے کس پر کس نے نہیں چُکایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

ذہن بھی سُوکھ کے رہ جاتا ہے پیٹ اگر ہو خالی
جسم میں رُوح کو دفنا دیتی ہے مفلوک الحالی
ریت کے اندر لگنے والا پودا کب لہرایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

ہتھیاروں کی دوڑ میں سب سے آگے جانے والو
ایشیا وافریقہ کی جانب بھی نگاہ ڈالو
آپ گلے بچوں کے گھونٹے وقت کی ظالم دایا
بچے دُنیا کا سرمایا

بانٹ رہے ہو انگارے اور لقمے چھین رہے ہو
جلّاد و ماؤں کی گود سے بچّے چھین رہے ہو
کیا محسوس کرو گے تم یہ وقت جو تم پر آیا
بچّے دُنیا کا سرمایا

صحت دولت علم محبت عام نہیں کیوں کرتے
سُکھ ہو جس سے دُنیا میں وہ کام نہیں کیوں کرتے
جنگوں کے دیس چھوڑ دلوں میں امن کا ڈھونگ رچایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

کاش زمانے بھر کے بچے پھولیں پھلیں ہمیشہ
جیون کی ٹھنڈی ٹھنڈی راہوں پر چلیں ہمیشہ
ہر بچّے کو ہر دُکھ سے رکھنا محفوظ خدایا
بچّے دُنیا کا سرمایا

ہمارا ماضی

مسافرِ حال کو بتا دو کہ ہم نے کیسے سفر کیا ہے
اُڑائی ہے اپنی خاک صدیوں تو وقت کے دل میں گھر کیا ہے

لگن تھی منزل کی ہر قدم کو جنوں تھا آزادیوں کا ہم کو
ہوا میں شعلے پہن کے نکلے، فصیلِ آہن میں دَر کیا ہے

غبار اُڑاتے جدھر سے گزرے ہزار سیلاب سر سے گزرے
طویل عمروں کی طرح ہم نے ہر ایک لمحہ بسر کیا ہے

تھکن سے ٹوٹا ہے جسم اپنا تو رنگ لایا طلسم اپنا
زبان پر جب پڑے ہیں کانٹے لہو سے دہن کو تر کیا ہے

کشید کی زردیوں سے لالی، اُفق اُفق پر کمند ڈالی
نشیبِ حالات میں اُتر کر ہر اِک بلندی کو سر کیا ہے

کچھ ایسا مفہومِ خیر سمجھا کہ غیر کو بھی نہ غیر سمجھا
کیا ہے خود کو جو خرچ ہم نے تو پیار کے نام پر کیا ہے

برادرم سلیم طاہر (پروڈیوسر) کے اصرار پر یوم قائدِ اعظم کے سلسلے میں ہونے والے ٹی وی کے ایک پنجابی مشاعرے کے لیے زندگی میں پہلی بار یہ نظم لکھی

سوچ تری پاتالوں ڈونگھی، پربت تیں توں نیویں
داواں وِچ نیں تیریاں ساہنواں بھلّاں تینوں کیویں
توں میرے اندر جیویں
انگیاراں تے ٹُر کے سانوں توں پھلواری دِتّی
لَواہ کے اپنے موڈھیوں کِنّے سِر، سرداری دِتّی
ایہہ دھرتی پیاری دِتّی
ایہہ دھرتی ایہہ پیاری دھرتی جس تے جنّت رِجھّے
ایس دا واسی ایہدی مٹّی دے وِچ بھانبڑ بجھّے
کیہہ ہوسن بھلا نتیجے
اک دوجے دی پگ اُچھالن، پھڑے نہ کوئی پلّا
چار چفیرے بھیڑ بھڑکا، فیر وی آں ایں کلّا
ایہہ بھلتے یا میں جھلّا
جدوں تیک ایہہ زمیں رہوے گی ایہہ اسمان رہوے گا
رب رسول دا رسیا جے اک وی انسان رہوے گا
ایہہ پاکستان رہوے گا

رُخصتی

نئی منزل کی جانب کر رہی ہے تو سفر بیٹی
رہے تجھ پر ہمیشہ سایۂ خیر البشر بیٹی

مری سیمیں ؎ مری لختِ جگر، جانِ پدر بیٹی
نچھاور تجھ پہ ہوں خوشیاں ہی خوشیاں عمر بھر بیٹی

ترے دامانِ ہستی میں اُجالے ہی اُجالے ہوں
ترے ماتھے پہ ہو آراستہ تاجِ سحر بیٹی

یہ سونے اور چاندی سے زیادہ قیمتی شے ہے
سجانا زیورِ اخلاق اپنے جسم پر بیٹی

جدا کرتا ہے کون اپنی نظر سے دل کے ٹکڑے کو
یہی حکمِ خدا، دستورِ دنیا ہے مگر بیٹی

؎ بڑی صاحبزادی افشاں سیمیں جس کی شادی ۱۰ رمئی ۱۹۸۵ء کو ہوئی۔

سمجھنا نند کو بہنا تو خوشدامن کو ماں کہنا
تری سسرال ہی کہلائے گی اب تیرا گھر بیٹی

شریکِ زندگی شاہد قریشی سا مِلا تجھ کو
حقیقت میں ہے یہ ماں کی دُعاؤں کا اثر بیٹی

مظفر کے مقدر میں لکھی ہیں جس قدر سانسیں
نکلتی ہیں دُعائیں اُس کے دِل سے اُس قدر بیٹی

"کیا صُورتیں ہوں گی"

خواجۂ اجمیرؒ

چراغِ طاقِ حرم، آفتابِ ملکِ ہند
ترا وجود، سرابوں میں بحر کی مانند

تھی منطبق تری ہر سانس، حکمتِ رب پر
رہا مجددِ ہفتم صدی کے منصب پر

فریدِ خواجۂ عثمان ہرونی ٹھہرا
رہا ہمیشہ تہی دست اور غنی ٹھہرا

بہ حکمِ سرورِ کونین ہند میں آیا
دیارِ غیر میں پیغامِ دوستی لایا

اذانِ عشق بنا تیرے دم سے نغمۂ دیر
سلام، چلّہ کشِ روضۂ علی ہجویر

جو بت پرست تھی جس کی حیات بنجر تھی
وہ قوم حلقہ بگوشِ گدائے سنجر تھی

مَیں دُور رہ کے امیں ہُوں تری حرارت کا
عطا ہو کاش مجھے بھی شرف زیارت کا

بنامِ خالقِ دنیا بہ لُطفِ شاہ حجاز
غریبِ شہر پہ بھی اِک نظرِ غریب نواز

دسمبر ۸۳ء

شہیدِ ملّت[1]

لکھا ہے پیشانی سحر پر حسین کرنوں سے نام تیرا
ترے لہو کی شفق سے پھوٹے شہیدِ ملّت پیام تیرا

تو بازوئے قائدِ گرامی، ترا وطن دے تجھے سلامی
ہوا تری خاکِ پا کو چومے فضا کرے احترام تیرا

رہا درِ فہم باز تجھ پر کیا سیاست نے ناز تجھ پر
نظر نظر تھی کنیز تیری سخن سخن تھا غلام تیرا

وفاؤں کا شاہکار تھا تو متاعِ لیل و نہار تھا تو
غریب لمحوں کے کام آیا خزانۂ جاں تمام تیرا

خموش تو ہوگیا تو کیا ہے تری خموشی بھی اک صدا ہے
سماعتوں میں بھرا ہوا ہے خطاب تیرا کلام تیرا

[1] لیاقت علی خاں

خرد پشیماں ترے جنوں سے حیات شرمندہ تیرے خوں سے
زمیں پہ تیری بقا کے چرچے فلک پہ جنّت مقام تیرا

تو شیشۂ وقت میں جڑا ہے ہر ایک رستے میں تو کھڑا ہے
اصول ہے بات بات تیری چراغ ہے گام گام تیرا

مُرقّعِ جہد ذات تیری عمل کا نقشہ حیات تیری
یقیں سے بڑھ کر خیال تیرا سفر سے بڑھ کر قیام تیرا

حمید نظامی

لوحِ وطن پہ نقشِ دوامی کہیں جسے
وُہ مردِ حق حمید نظامی کہیں جسے

اُس کو خراج پیش کرے کیا مرِ قلم
خنجر کی طرح ہاتھ میں جس کے رہا قلم

تحریر پر عبور صداقت پہ ناز تھا
ذہن اُس کا غزنوی تھا مگر دِل ایاز تھا

خوشبو لکھی تھی اُس کی فراست کے بھاگ میں
کھِلتا رہا گلاب کی مانند آگ میں

منصب نہ منفعت نہ کسی نام کے لیے
ہر سانس اُس کی وقف تھی اسلام کے لیے

اقبال کی نظر میں خردمند کی طرح
بابائے قوم کے لیے فرزند کی طرح

دھڑکا نوائے وقت سے بھی تیز اُس کا دِل
مِلّت کے درد سے رہا لبریز اُس کا دِل

کِتنا مقام لفظ کی حُرمت کو دے گیا
منشُور جُراتوں کا صحافت کو دے گیا

دبتا نہ تھا کسی بھی وزیر و کبیر سے
ڈرتے تھے سربراہِ وطن اُس فقیر سے

اُس بندۂ جری سا کوئی اب مگر نہیں
اہلِ خبر کو آج خُود اپنی خبر نہیں

ابنِ انشاء

اِنشاجی تم کوچ کر گئے بن گئی غزل بہانہ کیا
ہوش کی باتیں جو کرتا ہو ایسا بھی دِیوانہ کیا

تم شہری کے شہری ٹھہرے اور صحرائی کے صحرائی
ڈھونڈے آج تمھارا سایا بستی کیا وِیرانہ کیا

تم ہر دِل میں رہنے والے مٹی کے نیچے جا سوئے
بھیگی پلکیں لے کر نکلے، اپنا کیا بیگانہ کیا

حرف و معانی بھی ہیں سوگی اور قلم بھی بنا ہے جوگی
اے روتوں کو ہنسانے والے ہنستوں کو یہ رُلانا کیا

سیاحی کا شوق تمھارا لے کے تمھیں کس دیس سدھارا
آتا نہیں جہاں سے کوئی ہو گئے وہیں روانہ کیا

جب کوئی پیدا ہوتا ہے سب ہنستے ہیں وہ روتا ہے
اِس دُنیا فانی دنیا میں آنا کیا اَور جانا کیا

اِتنا پیارا شخص مُظفر چھین کے لے گئی مَوت سِتمگر
جیتی جاگتی ایک حقیقت ہو گئی آج فسانہ کیا

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

وقت کے سنگ پہ اِک آئنہ گر اور گرا
اِک چراغ اور بجھا ایک شجر اور گرا

ایک مہتابِ سخن ہو گیا پیوندِ زمیں
تودۂ خاک پہ اِک اہلِ نظر اور گرا

موت آندھی کی طرح کوچۂ جاں سے گزری
ڈھے گئی ایک فصیل اور بھی، دَر اور گرا

ابھی انشا ہی کا غم آنکھ نہیں بھولی تھی
ڈھل کے اشکوں میں مِرا خونِ جگر اور گرا

قافلے والو رُکو اس کو سلامی دے لو
ایک رہ گیرِ سرِ راہ گزر اور گرا

رُخ پہ گہرائی کی شکنیں ہیں صدف مٹھی میں
اِک شناور لبِ دریا سے ہُنر اور گِرا

لاؤ پھولوں کا کفن روشنیوں کی چادر
ایک خُورشید بجاں خاک بسر اور گرا

اس کی سانسیں بھی لپٹ جائیں نہ سناٹوں سے
آسماں سے پہ منظؔر کے اگر اور گِرا

مولانا مودودی

ٹوٹ کر سورج گرا کر زمیں پریشاں ہو گئیں
دفن اِک لمحے میں جانے کتنی صدیاں ہو گئیں

سرزمینِ پاک سے اِک آسماں سا اُٹھ گیا
بستیوں کی بستیاں شہرِ خموشاں ہو گئیں

چل دیا سوتے عدم اسلام کا بطلِ جلیل
کس قدر سونی دیارِ دیں کی گلیاں ہو گئیں

اس کا ظاہر روشنی تھا اس کا باطن روشنی
خاک کے نیچے بھی شمعیں سی فروزاں ہو گئیں

علم و عرفاں رو رہے ہیں ایک کونے میں کھڑے
زندگی کی ساری قدریں مرثیہ خواں ہو گئیں

پتھروں کو حرفِ حق کہنے کی جرأت دے گیا
برف جیسی سرد سوچیں شعلہ جاں ہو گئیں

مشرق و مغرب پہ لہرائی نگاہِ دُور بیں
فکر کی گہرائیاں "تفہیمِ قرآں" ہو گئیں

مردِ عصرِ نو کہوں یا وارثِ ماضی کہوں
ختم کیسی کیسی تحریکاتِ دَوراں ہو گئیں

کتنا گہرا زخم آیا ہے مظفرؔ رُوح پر
خوں کی بُوندیں مری آنکھوں میں پنہاں ہو گئیں

جوشؔ

کتنا بڑا ستم ملک الموت کر گیا
اک نسل ختم ہو گئی اک دور مر گیا

اک آفتابِ علم و ہنر ہو گیا غروب
تاریکیٔ ابد میں اُجالا اُتر گیا

خالی پڑا ہے تختِ شکوہِ سخن وری
عالم پناہِ مملکتِ فن کدھر گیا

سینے میں سانس رک گئی شبیرؔ خاں کے
یا کاروانِ گردشِ دوراں ٹھہر گیا

تو جوشؔ سے عظیم سخنور کو کھا گئی
خوش ہو زمین اب تو ترا پیٹ بھر گیا

اُردو زباں کیوں نہ پریشان حال ہو
لفظوں کی طرح آج اِک انساں بکھر گیا

لپٹی ہُوئی کفن میں بلندیٔ فکر ہے
وُہ زیرِ خاک بھی مہ و انجم بسر گیا

بس اُس کے نظریے سے نہ تھا متفق مگر
مجھ کو بھی ادھ مُوا سا منظر وہ کر گیا

احسان دانش

تاریخ کو گھڑنے کا ہنر تھا ترے اندر
اک عہدِ ادب گرمِ سفر تھا ترے اندر

ریشم سی طبیعت تجھے بخشی تھی خدا نے
فولاد کا انسان مگر تھا ترے اندر

تاریکیٔ عالم تری آنکھوں میں بھری تھی
اور مطلعِ انوارِ سحر تھا ترے اندر

مزدور کے ماتھے کا پسینہ تری سوچیں
شبنم ترے لب پر تھی شرر تھا ترے اندر

دانش کدۂ عالمی تھا ذات میں اپنی
اک مجمعِ اربابِ نظر تھا ترے اندر

ہستی تری افکار کا اک تاج محل تھی
لیکن ترے خوابوں کا کھنڈر تھا ترے اندر

تُو ساحلِ خاموش نظر آتا تھا لیکن
طُوفاں تھا تلاطم تھا بھنور تھا ترے اندر

شعروں میں بساتا رہا کتنی ہی بہشتیں
کتنے ہی خرابوں کا گزر تھا ترے اندر

جو آج ہے سویا ہُوا احسانؔ لحد میں
پہلے ہی سے وُہ خاک بسر تھا ترے اندر

ظہورِ نظر

ایک صحرا نشیں
خاک صحراؤں کی چھانتے چھانتے خاک میں مل گیا
لالۂ حرف، شاخِ اَبد پر سدا کے لیے کھِل گیا

ایک شعلہ جبیں
ریزہ ریزہ ہُوا غم کے کوہِ سیہ چاٹتے چاٹتے
عمر ساری کٹی، روشنی بیچتے تیرگی کاٹتے

اِک صدائے حسیں
موت کی گہری خاموشیوں کے سفر پر روانہ ہُوئی
وُہ متاعِ اَدب، صرف دو گز زمیں کا خزانہ ہُوئی

وہ تو ہم میں نہیں

ہم ہیں اُس میں مگر، وہ ہمارا بڑا بھی تھا اور یار بھی
اُس کے پسماندگاں اُس کے بچے بھی ہیں اُس کے اشعار بھی

حفیظ جالندھری

حفیظ بھی گزر گیا
صدی کا ہمسفر گیا
وہ آسمانِ شاعری
زمیں میں اُتر گیا — حفیظ بھی گزر گیا

وہ جس کی روشنیِ حرف، وِردِ شہر و دشت ہے
ترانۂ وطن میں جس کے دِل کی بازگشت ہے
وہ خوش نوا کدھر گیا
حفیظ بھی گزر گیا

وہ علم کا جمال تھا، وہ شعر کی اُٹھان تھا
بقول اُس ضعیف کے، ابھی تو وہ جوان تھا
ابھی سے کیوں وہ مر گیا
حفیظ بھی گزر گیا

سلام، گیت اُداس ہیں غزل کی مانگ اُجڑ گئی
ٹھہر گیا ہے وقت بھی یہ کس کی سانس اُکھڑ گئی
یہ کون دیدہ ور گیا
حفیظ بھی گزر گیا

وُہ جس کا قبلۂ خرد بھی عشق کی طرف رہا
جو پتھروں کے عہد میں بھی آئنہ بکف رہا
گیا وُہ شیشہ گر گیا
حفیظ بھی گزر گیا

مفارقت کے داغ عظمتِ قلم کو دے گئے
جو زخم، دانش و فراق و جوش ہم کو دے گئے
وہ زخم تازہ کر گیا
حفیظ بھی گزر گیا

وُہ چل بسا مگر ہے اُس کے ہر سخن میں زندگی
عدم سے لائی تھی اُسے جہانِ فن میں زندگی
دراصل اپنے گھر گیا
حفیظ بھی گزر گیا

میں اُس کی یاد کے اُجاڑ سے بھی بھول پاؤں گا
مظفرؔ اس کا پیار جیتے جی نہ بھول پاؤں گا
فنا مجھے بھی کر گیا
حفیظ بھی گزر گیا

سلیم احمد

سلیم احمد تمہیں کس نے کہا تھا — کہ اتنی جلد دُنیا چھوڑ جاؤ
ابھی اِک عرصہ چل سکتے تھے جس پر — وُہ رستہ زندگی کا چھوڑ جاؤ

○

تمہیں تو ناز تھا سب دوستوں پر — تمہیں بد دل کیا دُنیا سے کس نے
سلیم احمد بھی جینا چاہتا ہے — شکایت جا کے کی فردا سے کس نے

○

وجودِ خاک کو بھی تم نے اپنے — کتابِ روشنی کا باب جانا
سِدھارے تم عدم کو سوتے سوتے — اجل کو زندگی کا خواب جانا

○

ادب اَور دیں ہوں یکجا جس کے پیچھے — اُس آئینے میں صورت تھی تمہاری
وفا کو عشق کو سچائیوں کو — ابھی کتنی ضرورت تھی تمہاری

○

تمہیں تھی دسترس ہر ایک فن پر — ادیب و شاعر و نقّاد تھے تم
تمہاری ذات تھی یا کوئی لشکر — اکیلے تھے کہ لاتعداد تھے تم

○

رہے ہریالیوں میں تم ہمیشہ — تمہیں چاہا گروہِ رنگ و بُو نے
تمہارا غم نہیں محدودِ خانہ — کیے تم نے دِلوں کے شہر سُونے

○

گلے سے تم لگانا چاہتے ہو — میں جب بھی تم سے ملتا بھانپ لیتا
تمھاری مسکراہٹ کا لڑکپن — بزرگی کو تمھاری ڈھانپ لیتا

○

نہ کی ہو جس نے شاگردی تمھاری — ادب میں کوئی ایسا گُر نہ ہوگا
تمھاری موت اِک ایسا خلا ہے — گزرتے وقت سے جو پُر نہ ہوگا

فیض احمد فیض

گُل ہو گئی اَے فیض تِری شمع حیات
لیکن تو اندھیروں میں بھی تابندہ ہے

اے چادرِ خاک اوڑھ کے سونے والے
مٹّی بھی تجھے چھُو کے درخشندہ ہے

موت آنے سے مرتے نہیں اربابِ ہُنر
جب تک ترا فن زندہ ہے تو زندہ ہے

ٹُوٹے گا نہ رشتہ ترا دُنیا سے کبھی
تو عہد مسلسل کا نمائندہ ہے

تو سج گیا آئینۂ رفتہ میں مگر
تخلیق تری نغمۂ آئندہ ہے

کنیز فاطمہ (والدۂ مرحومہ)

لپٹ گئی مری سانسوں سے گھر کی ویرانی
یہ غم وہ غم ہے جو پتھّر کو بھی کرے پانی
جُدا کیا مجھے کیوں تُو نے ماں کے قدموں سے
مرے خُدا تری جنّت اگر نہیں فانی
زرہ دُعاؤں کی پہنائے گا مجھے اب کون
کرے گی کس کی محبّت، مری نگہبانی
حرارتِ لبِ مادر سے ہو گیا محروم
مرا بدن، مرے رُخسار، میری پیشانی
ہر اِک نگاہ پہ اُس کی ہوئی ہمیشہ نثار
تمام خوبیٔ تہذیب، قدرِ انسانی
دعا یہ ہے کہ رہے اُس پہ تا ابد مولا
ترے کرم ترے انوار کی فراوانی
ثواب اُس کا مرے والدین کو دینا
قبول ہو جو مرا کوئی کارِ ایمانی
فرشتے کاش پکاریں اُسے قیامت میں
کنیز فاطمہ، جنّت نشین، رحمانی

۱۳۹۰ھ